افکارِ آزاد

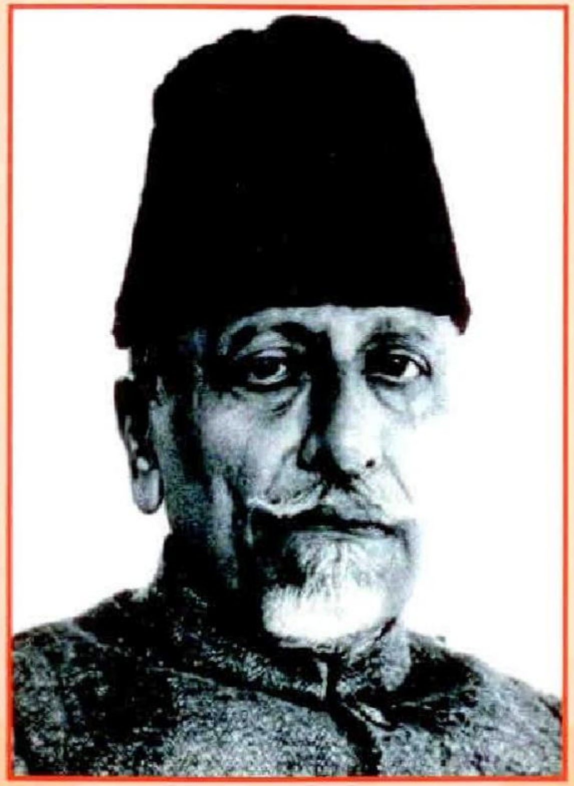

مرتبہ

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر و انچارج

مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد

افکارِ آزاد

مرتب

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر و انچارج

مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication Series - 6

Book : *Afkaar-e-Azad*

Publication Date : November 2009

Quantity : 500

Publisher : Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad - 500023

Compiled by : Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed
Dy. Director & I/c
Centre for Urdu Language, Literature & Culture

Assited by : Amena Anjum, Mohd. Habeebuddin

Printing : Silverline Printers, Hyderabad

Address : Centre for Urdu Language, Literature & Culture
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032, A.P. India
Phone Nos. : 040-23008359, 23008360
Fax No. : 040-23008383

© جملہ حقوق بحق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد محفوظ
سلسلہ اشاعت ۔۶

کتاب : افکارِ آزاد

اشاعت : نومبر ۲۰۰۹ء

تعداد : ۵۰۰

ناشر : رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد

مرتب : ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج
مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت

معاونین: آمینہ انجم، محمد حبیب الدین

طباعت : سلور لائن پرنٹرس، حیدرآباد

پتہ : مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد
فون نمبر۔ 040-23008359, 23008360
فیکس نمبر۔ 040-23008383

ترتیب

۱۔ اسلام کی روحِ حرّیت

۲۔ اسلام نے شیطانی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا

۳۔ اسلام نے ظالموں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا

۴۔ اسلام ہی دنیا کو تباہی سے بچا سکتا ہے

۵۔ قرآن کا مقصد

۶۔ آہ! وہ دلوں کا سوز و گداز کہاں؟

۷۔ مقاصدِ حج

۸۔ اسلامی دستور العمل میں فوجی روح پوشیدہ ہے

۹۔ سیرت سرورِ کونین صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کا جشن ولادت

۱۱۔ حُسنِ رسولؐ

۱۲۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی قربانی

۱۳۔ اُسوۂ حسینؑ

۱۴۔ شہادت حسین علیہ السلام

۱۵۔ عظیم الشان قربانی

۱۶۔ دعوتِ عزم و عمل

۱۷۔ اصلاح عالم کے لیے جہاد

۱۸۔ مسلمان دنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں

۱۹۔ مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل

۲۰۔ العصر

۲۱۔ ابتدائے عشق

۲۲۔ زندہ دلوں کا وطن

۲۳۔ پیغام اصلاح و ہدایت

۲۴۔ محدثین کرامؒ کا تذکرۂ جمیل اور اُن کی مساعی جمیلہ

۲۵۔ حضرت سرمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

۲۶۔ مبادلۂ سنین

۲۷۔ الاخلاق

۲۸۔ مذہب و سائنس

۲۹۔ سقوطِ اَدرنہ

۳۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بہ یک نظر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی 1998ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت کل ہند دائرہ کار کی حامل یونیورسٹی کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ ایکٹ کے مطابق اردو زبان کی ترویج و ترقی، اردو ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی اور تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ اس یونیورسٹی کے مقاصد میں شامل ہیں۔ ایکٹ میں یونیورسٹی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ فاصلاتی اور کیمپس (روایتی) دونوں طریقوں سے تعلیم فراہم کرے۔

یونیورسٹی نے اپنے قیام کے پہلے ہی سال نظامت فاصلاتی تعلیم کے قیام کے ذریعہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد کے ساتھ ایک یادداشت مفاہمت کے ذریعہ اس کے نصابی مواد کے استعمال اور ترجمہ کے حقوق حاصل کیے گئے اور بی اے ڈگری پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بی ایس سی اور بی کام کورس بھی شروع کیے گئے۔ بی۔کام کا سارا نصابی مواد اردو زبان میں خود یونیورسٹی نے تیار کیا۔

یونیورسٹی میں اس وقت چار گریجویٹ، چار پوسٹ گریجویٹ، تین سرٹی فکیٹ اور دو ڈپلومہ پروگرام فاصلاتی تعلیم کے ذریعہ ملک بھر کے 141 اسٹڈی سنٹروں پر چلائے جارہے ہیں جبکہ جدہ (سعودی عرب) میں اس کا ایک امتحانی مرکز بھی موجود ہے۔ 1.57 لاکھ طلبہ کی تعداد (جن میں 58 ہزار اس وقت منسلک ہیں) کے ذریعہ یونیورسٹی کی فاصلاتی تعلیم کی کوششوں کو اردو بولنے والوں کی بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس پذیرائی سے حوصلہ پا کر یونیورسٹی، برطانیہ اور امریکہ میں بسنے والے اردو داں عوام کی درخواست پر لندن اور امریکہ کے مختلف شہروں میں امتحانی مراکز کے قیام کی

کوششوں میں مصروف ہے اور جلد ہی ان کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

ملک کے مختلف حصوں میں فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو تعلیمی و انتظامی مدد فراہم کرنے کے لیے 9 علاقائی مراکز (دہلی، پٹنہ، بنگلور، بھوپال، دربھنگہ، کولکتہ، سری نگر، ممبئی اور رانچی میں ایک ایک) اور 6 ذیلی مراکز (لکھنؤ، میوات، جموں، سنبھل، امراوتی اور حیدرآباد) قائم کیے گئے ہیں۔

یونیورسٹی نے 6 اسکولس آف اسٹڈی اور 13 شعبہ جات کے قیام کے ذریعہ روایتی تعلیم کے محاذ پر بھی پیش رفت کی ہے۔ 2002ء میں ڈپلومہ ان ایجوکیشن کے کورس سے کیمپس (روایتی) تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی مختلف مضامین میں پی ایچ ڈی، ایم فل اور پوسٹ گریجویٹ کورسس فراہم کر رہی ہے۔ ان کے علاوہ کیمپس میں ڈپلومہ، پی جی ڈپلومہ، ٹیچرس ٹریننگ اور آئی ٹی آئی ٹریڈس کے کورس بھی فراہم ہیں۔

یونیورسٹی نے خصوصیت سے تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے دربھنگہ، بنگلور اور حیدرآباد میں صنعتی تربیتی ادارے (آئی ٹی آئی) قائم کیے جہاں الیکٹریشن، پلمبنگ، الیکٹرانک میکانک، ایرکنڈیشن و ریفریجریشن اور سیول ڈرافٹس مین کے شعبہ جات موجود ہیں اور ہر شعبہ میں 40 طلبہ کو داخلہ دیا جا رہا ہے۔ حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں پالی ٹیکنک کالجس کے آغاز کے ذریعے بھی یونیورسٹی نے ایک نئی جہت لگائی ہے۔ کمپیوٹر، انفارمیشن ٹکنالوجی، الکٹرانکس اینڈ کمیونیکیشن اور سیول انجینئرنگ جیسے ڈپلومہ کورسس پہلی مرتبہ اردو میں متعارف کیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی نے دربھنگہ، سری نگر اور بھوپال میں ٹیچرس ٹریننگ کالج بھی قائم کیے ان کے علاوہ دربھنگہ اور حیدرآباد میں ماڈل اسکول کا بھی قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

فاصلاتی تعلیم سے ذرائع ابلاغ کو مربوط کرنے کے ایک حصہ کے طور پر ذرائع ابلاغ کے پروگراموں کی تیاری کی غرض سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کیمپس میں ایک مکمل

انسٹرکشنل میڈیا سنٹر قائم کیا ہے۔ اگرچہ انسٹرکشنل میڈیا سنٹر ابتدائی طور پر یونیورسٹی کی فاصلاتی تعلیم کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے لیکن مستقبل میں یہ روایتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی اضافی اکتسابی مواد فراہم کرے گا تاکہ کلاس روم کے اکتساب میں مزید اضافہ ہو۔ یہ سنٹر ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم اور اسی طرح کے دوسرے شعبوں کے لیے عملی تجربہ گاہ کی حیثیت سے بھی کام کرے گا۔

یونیورسٹی نے اپنے قیام کے 10 سال کی تکمیل پر دوردرشن کے ساتھ بھی ایک یادداشت مفاہمت پر دستخط کیے ہیں جس کے تحت جنوری 2008ء سے دوردرشن اردو چینل پر فاصلاتی تعلیم کے پروگرام اور اردو زبان کے تاریخی، تہذیبی اور لسانی پس منظر اور موجودہ صورت حال پر مختلف پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے جا رہے ہیں۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے 9 جنوری 2008ء کو اس کا افتتاح انجام دیا۔

جنوری 2007ء میں یو جی سی کی جانب سے یونیورسٹی میں اکیڈمک اسٹاف کالج کا قیام بھی ایک قابل ذکر کامیابی ہے۔ یہاں پر لکچررس کے لیے اورینٹیشن اور ریفریشر کورسس کے علاوہ کئی دیگر تعلیمی سرگرمیاں انجام دی جا رہی ہیں۔

اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ و صدر مدرسین کو ان کے متعلقہ مضامین میں تربیت اور انہیں تدریس کی جدید حکمت عملیوں سے واقف کروانے کے لیے مرکز (اکیڈمی) برائے پیشہ ورانہ فروغ اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم (CPDUMT) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان کے علاوہ سنٹر فار سوشیل ایکسکلوژن اینڈ انکلوژیو پالیسی (CSSEIP) اور مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت (CULLC) کا قیام بھی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی اہم کامیابیاں ہیں۔

یونیورسٹی اس نظریہ کے تحت کام کرتی ہے کہ اس کی کوششوں کے ذریعہ اردو داں افراد کو جدید تعلیم، تعلیمی قابلیت اور دانشورانہ اکتساب کے مواقع فراہم ہوں۔ اردو بولنے والوں کو بااختیار بنانے

سے متعلق راہ نمایانہ اصولوں کو پیش نظر رکھ کر یو.جی.سی کے د منصوبے کے تحت منظور شدہ مختلف ترقیاتی اسکیموں کا آغاز کیا گیا۔ان میں مرکز برائے مطالعات نسواں' علاقائی مرکز دہلی پر مرکز برائے مطالعات نہرو' اقلیتی طلبا کے لیے UGC-NET کوچنگ سنٹر' اردو داں افراد کو ان کی انگریزی لیاقت میں اضافہ کے لیے خصوصی کوچنگ سنٹر' سرکاری ملازمتوں میں داخلہ کے لیے اقلیتی طلبا میں مسابقت بڑھانے کے لیے سنٹر فار کوچنگ آف مائناریٹی کینڈیڈیٹس کا قیام شامل ہے۔

جولائ 200ء میں اگنو ہیڈ کوارٹر (دہلی) میں منعقدہ تقریب میں مولانا آزاد نیشنل اُردو 'ندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) نے فاصلاتی تعلیم کے اردو ویڈیو پروگرامس لیے ایک یادداشت مفاہمت پر دستخط کیے ہیں۔اس یادداشت مفاہمت سے فاصلاتی ٹرانک تدریسی مواد کے اشتراک کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔آ کاش وانی حیدرآباد کے ساتھ ۔ی کی تعلیمی نشریات کے ضمن میں 9رجنوری 2009ء کو ایک یادداشت مفاہمت پر دستخط کے گئے جس کے باعث ملک کے طول وعرض میں ریڈیائی نشریات کے ذریعہ فاصلاتی تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے۔

یونیورسٹی کیمپس میں مختلف عمارتوں کا تعمیری کام کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور نظامت فاصلاتی تعلیم' عمارت درس وتدریس' مرکز اردو زبان' ادب وثقافت' انسٹرکشنل میڈیا سنٹر' آئی ٹی آئی' کز برائے پیشہ ورانہ فروغ اساتذہ' اردو ذریعہ تعلیم وغیرہ جیسے دفاتر اپنی عمارت میں منتقل ہوچکے ہیں۔لڑکوں اور لڑکیوں کے ہاسٹل اور اسٹاف کے کوارٹرس کی تعمیر بھی ہوچکی ہے۔طلبہ اور عملہ کو سہولت فراہم کرنے کے لیے کیمپس میں اے ٹی ایم کے ساتھ انڈین اوور سیز بینک کی شاخ قائم کی گئی ہے اس کے علاوہ ڈاک خانہ اور ہیلتھ سنٹر کا بھی قیام عمل میں آچکا ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی منظوری سے قائم کیا

جانے والے اردو میوزیم جس کا سنگ بنیاد عزت مآب پروفیسر سیف الدین سوز مرکزی وزیر برائے آبی وسائل کے ہاتھوں 27راپریل 2006ء کو رکھا گیا۔بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت رکھا گیا۔مرکز کی نو تعمیر شدہ عمارت کا افتتاح 16رجون 2007ء کو پروفیسر اے۔آر۔قدوائی عزت مآب گورنر ہریانہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

مرکز کے قیام کا مقصد اردو زبان کے تہذیبی و جمالیاتی اقدار، ادب اور تاریخی شعور کی حفاظت اور ترقی ہے۔اس کے ساتھ ہی اسے میوزیم، لائبریری، محافظ خانہ اور ثقافتی تحقیق کے ادارے کا مشترکہ روپ دینا بھی شامل ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ خواہش بھی وابستہ ہے کہ اردو زبان اور ثقافت سے متعلق اشیاء کو یکجا کرنے اور انہیں محفوظ رکھنے کے نقطۂ نظر سے اس مرکز کو حرفِ آخر سمجھا جائے۔راقم اس مرکز کا انچارج ڈائرکٹر ہے۔مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت میں ایک گیلری ''مانو۔بہ یک نظر'' کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔اس گیلری میں تصاویر کے ذریعہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی بارہ سالہ تاریخ دکھائی گئی ہے۔مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت میں ایک اور گیلری گوشۂ آزاد سے موسوم ہے۔یہ گیلری مولانا آزاد کی یادگار تصاویر اور اُن سے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے۔

مرکز برائے اردو زبان ادب وثقافت میں ''گوشۂ آزاد'' کا افتتاح پروفیسر شمیم جیراجپوری' سابق وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ہاتھوں ۲۰رفبروری ۲۰۰۹ء کو عمل میں آیا۔اس گوشہ کے قیام کا مقصد مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق تمام معلومات کو محفوظ کرنا ہے تاکہ نئی نسل اپنے اسلاف کے کردار اور کارناموں سے بہرہ ور ہوسکے اور ان میں تقلید کا جذبہ پیدا ہوسکے۔

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

حرف آغاز

مولانا آزاد اس پرشکوہ ومنفرد شخصیت کا نام ہے جو بیک وقت ایک مدبر، ایک مفکر، ایک سیاست دان، ایک دانشور، ایک ادیب، ایک صحافی، ایک معلم اخلاق اور ایک مذہبی عالم کی حیثیت سے مقبول ومعروف رہی ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت میں فہم وفراست اور علم وعرفان کی ایک وسیع دنیا آباد تھی۔ وہ قوم وملت کے سچے غمگسار اور مسلمانوں کے تعلیمی وفکری ارتقاء کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ مولانا آزاد میں ہمہ گیری کی صفت بہت بڑے پیمانے پر موجود تھی۔ ایک ماہر تعلیم کو ان کے کردار کی جو چیز سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے وہ ان کا علم وفضل ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ دینی علوم کے تبحر کے ساتھ عقلیات اور فلسفہ کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے۔ اور علم وادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے۔ پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان عملی سیاست سے اتنا دور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اٹھ سکتے ہیں۔ مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی ترجمان ہے گویا ان کی زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی زندگی میں اپنے آپ کو کبھی ادیب کی حیثیت سے پیش نہیں کیا' وہ درحقیقت خیالات کے امام ہیں۔ جہاں تک اسلامیات کا تعلق ہے مولانا آزاد ہندوستان میں عالم بے بدل ہیں۔ بہت کم لوگوں میں ان دو خوبیوں کا امتزاج نظر آتا ہے یعنی وہ ادیب بھی ہوں اور پر جوش خطیب بھی۔ مولانا آزاد میں یہ دونوں چیزیں حیرت انگیز حد تک یکجا تھیں ان کا گہرا مطالعہ اور قابلیت ان کی تحریر کے ہر ایک صفحہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنا ایک منفرد اسلوب

نگارش پیدا کیا ہے بلکہ وہ علم وفضل کے اس بلند مقام پر نظر آتے ہیں جہاں عالم اسلام کے دوسرے ہم عصر نہیں پہنچ سکے۔

مولانا آزاد کی شخصیت پر ''مولانا آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت'' عنوان سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے راقم ہی کی زیر ادارت 2006ء میں ایک کتاب شائع کی تھی جس میں مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا آزاد کے بلیغ نظریات کو عام کرنے کے لیے یہ دوسری کتاب ''افکار آزاد'' یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے زیر اہتمام شائع کی جارہی ہے۔ اس کتاب میں متنوع موضوعات پر مختلف مضامین کو جو متفرق اخبارات اور رسالوں کی زینت تھے یکجا کیا گیا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اس کتاب میں شامل بعض مضامین میں مولانا نے کہیں کہیں ایسے الفاظ کا استعمال کیا تھا جو آج یا تو متروک ہو چکے ہیں یا مستعمل نہیں ہیں تاہم بقول شاعر؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزہ نہ رہا

راقم نے بڑی ہی احتیاط کے ساتھ کسی بھی لفظ کے املا میں بھی ترمیم وتبدل کے بغیر ہر لفظ کو جیوں کا توں نقل کیا ہے اس کے باوجود بھی نادانستہ طور پر کوئی سہو رہ جائے تو قارئین سے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کتاب پر اپنی قیمتی رائے دینے کی گذارش ہے۔

مرکز کے زیر اہتمام کتابوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

اسلام کی روح حرّیت

اس بارے میں اسلام کی تعلیم اوراس کے نظائر بالکل صاف اور غیر مشتبہ ہیں اسلام نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ہر مسلمان پر فرض کردیا ہے۔اوراس اصول کو اعمدۂ دین متین واکبر اساطین قوام ملت سے قرار دیا ہے بلکہ اصل شرف وامتیاز ملت مرحومہ (کنتم خیرامة اخرجت للناس ، تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر۔) احادیث کو دیکھا جائے تو منجملہ احادیث کے ایک مشہور حدیث (صحیح مسلم) میں ملتی ہے۔جس کو (ابوسعید) حذریؓ نے روایت کیا ہے ۔من رای منکم منکرا فليغيره بيده فان لم تسطع فبلسانه فان لم تستطع فبقلبه و ذالك اضعف الايمان۔ تم میں سے جومسلمان کوئی خلاف حق بات دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ کے زور سے اس کا انسداد کرے اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اس کی برائی ظاہر کردے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ دیکھے تو خیر، دل ہی دل میں اسے بُرا سمجھے، مگر یہ آخری صورت ایمان کا نہایت ضعیف درجہ ہے۔

نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی اس روایت کو لیا ہے اور نسائی کی روایت میں ہر صورت کے بعد ''فقد بری'' کا لفظ بھی موجود ہے، کہ اگر اتنا بھی اس نے کردیا تو اپنے فرض سے بری ہوگیا۔

اس کے بعد خود آنحضرتؐ اور صحابہ کرام کا طرز عمل ہے، اس کا یہ حال ہے کہ نہ صرف خلفائے اربعہ، بلکہ خود مہبط وحی، اور مورد ''وما ینطق عن الھویٰ'' کے سامنے صحابہ بے دھڑک اپنے اعتراضات وشبہات پیش کرتے تھے اور ان کی جرأت افزائی کی جاتی تھی ، حضرت عمر نے (صلح حدیبیہ) کے موقعہ پر جس سختی سے اپنا اعتراض پیش کیا تھا وہ ہر تاریخ میں مل سکتا ہے۔

خلفائے اسلام کا اس بارے میں جو طرزِ عمل تھا، وہ آج کل بار بار دہرایا جا چکا ہے، حضرت (عمر) کے زمانے میں جس شخص کا جی چاہتا تھا، واللہ ماعدلت یا عمر'' کہہ کر سرِ راہ ٹوک دیتا تھا، اور وہ اس سے خوش ہوتے تھے کہ اسلام اور عربی خون کی آزادی کا اصلی جوہر ہے۔ البتہ (بنی امیہ) نے اس روحِ حریت کو غارت کیا اور لوگوں کی زبانوں پر تلوار کی ضرب سے مہر لگادی۔

یا سبحان اللہ!! جس قوم کے ہر فرد کو سید المرسلین کے جانشینوں سے بیت المال کے حساب لینے کا حق تھا، اور وہ جب چاہتے تھے، خلیفہ اسلام کی دیانتداری کو جانچ سکتے تھے آج ان کو کہا جاتا ہے کہ ان لیڈروں کے آگے قوم کے روپے کی نسبت کوئی رائے نہ دو جن کو اور تو اور آج تک اسلام کے عام احکام صوم وصلوٰۃ پر بھی عمل کرنے کی توفیق کبھی نہیں ملی!! فما لھا اولا، القوم ،لا یکادون یفقھون حدیثا۔

اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی خاموشی اور غلط اصول اعتماد سے کام کرنے والوں کو جس مطلق العنانی کا عادی بنا دیا تھا، اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ خود کام کرنے والے تو اب اس طرح کی کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے، ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو قوم کی مداخلت کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں، لیکن یہ ان کے خواہ مخواہ کے دوست اس طرح کے خیالات ظاہر کر کے پبلک میں لیڈروں کو اور زیادہ بدنام کر رہے ہیں۔

نگارشات آزاد

☆☆☆

اسلام نے شیطانی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا

اسلام سے قبل دنیا جمہوریت کے لفظ سے نا آشنا تھی

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دین دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے دونوں جہان کی برکتیں اُس کے دامن میں پوشیدہ ہیں۔ ایسی حالت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کا خزانہ ہدایت میں دنیاوی سیاست کا وجود نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ نصف خدمت خلق سے معذور رہا۔ یہ ایک ایسی غلط بات ہے جو کسی مسلمان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں نوع انسانی کی ہدایت کی ہے اُسی طرح وہ روزِ ازل ہی سے دنیاوی سیاست میں بھی انسان کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔

آج چودہ سو برس قبل کا واقعہ ہے کہ دنیا استبداد واستعباد کے عذابِ الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اُس کا بند بند جکڑ رکھا تھا فرماں روایان ملک، اُمرائے شہر اور روسائے قبائل اپنے اپنے علاقوں میں فرعون بنے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں اللہ کی مخلوق محض اُن کے اتباعِ نفس کے لیے تھی۔ اس زمانہ میں ذاتِ شاہی ہر تقدیس سے متصف اور ہر عیوب سے مبرّا تھی کیوں کہ وہ خدا تھی۔ خدا کا سایہ تھی یا کم از کم مرتبۂ انسانیت سے ایک بالاتر شے ضرور تھی۔

فراعنہ مصر دیوتا تھے۔ اسی لیے مصر کے ایک فرعون نے مسیح سے ۱۷۰۰ برس پہلے ''اِنَّا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ''یعنی ''موسیٰ کا خدا کون ہے؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں'' کہا تھا۔ کلدانیوں کے ملک میں نمرود کی پرستش کے لیے ہیکل بنائے جاتے تھے۔ روما کا پوپ خدا کے فرزند کا جانشین تھا۔ اور اُس کا آستانۂ قدس سجدہ گاہ ملوک وسلاطین بنا ہوا تھا۔

رُوم کے قیصر اور فارس کے کسریٰ گو دیوتا نہ تھے۔ لیکن فطرت بشریہ سے منزہ۔ اور مرتبۂ انسانیہ سے بلند تر ہستی تھے۔ جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع، جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ، جن کا نام لینا سوءِ ادب اور جن کی شان میں ادنیٰ سا اعتراض بھی موجب قتل تھا۔ بیت المال اُن کا ذاتی سامان تھا۔ اور رعایائے ملک غلامانِ شہنشاہی تھے۔

دنیا اس غلامی، ذلت اور تحقیر میں مبتلا تھی کہ بحر احمر کے ساحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک ''عربی شہنشاہ'' کا ظہور ہوا جس نے اپنے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیے، بابائے روم کے ایوانِ قدس کی بنیادیں ہلا دیں۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اُس کی شمشیر غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ اور حریت خیال و رائے و شرف و احترام نفس انسانی اور مساوات حقوق کی روشنی تمام دنیا میں پھیل گئی۔ شاہانِ عالم مرتبہ قدوسیت سے گر کر عام سطح انسانی پر آ گئے اور عام انسان سطح غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔

یہ معجزانہ قوت و توانائی کیا تھی؟ جلالِ رُوحانی سے بھری ہوئی ایک آواز تھی جو بوقبیس کی پہاڑی سے بلند ہوئی اور جس سے گنبدِ عالم کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا کہ

> اے اہلِ عالم آؤ ایک بات جو اُصولاً و عقلاً ہم میں اور تم میں متفق علیہ ہے اُس کو عملاً بھی تسلیم کر لیں، یعنی خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں۔ نہ اُس کی خدائی میں کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم خدا کے سوا ایک دوسرے کو اپنا خدا اور آقا بنائیں۔

اس ایک آواز سے انسانی جباری اور اُلوہیت کے بُت سرنگوں ہو کر گر پڑے شہنشاہیوں کا پُر اسرار اور عجیب الخواص طلسم ٹوٹ گیا۔ بادشاہ رعایا کے خادم، بیت المال خزانہ عمومی بن گیا، اور تمام

انسان مساوی الرتبہ قرار پا گئے۔ عرب کے شہنشاہ نے نہ اپنے لیے قصر و ایوان تیار کرایا، نہ قاقم و دیبا کے فرش بچھائے، نہ سونے چاندی کی کرسیوں سے دربار سجایا۔ اور نہ اُس نے اپنی ہستی کو انسانیت سے مافوق بتایا بلکہ علی الاعلان کہا، ''میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں'' پھر دفعتاً سلطنت اسلامی کا ظہور ہوا۔ اور وادی مکہ میں عرب کے سب سے بڑے مجمع کے اندر اُس کے اس فرمان کا اعلان کیا گیا کہ

> اے اولادِ آدم! آج جان و مال کی حرمت قائم کی جاتی ہے جس طرح کہ آج کے روز سے اس شہر مکہ میں اور اس ماہِ حج میں حرمت ہے۔ ہوشیار ہو کہ جاہلیت کی تمام باتیں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ایام جاہلیت کی خوں ریزی اور اُس کے تمام واقعات آج سے فراموش ہو گئے۔

یہ ایک آواز تھی جس سے عرب کی پُر شور فضا میں سکوت طاری ہو گیا۔ امن عالم کا ابر چھا گیا۔ حکومت الٰہی کے اس داعی نے نصرانی شہزادہ طے سے فرمایا تھا کہ
''عرب کی بے اطمینانی سے نہ گھبراؤ۔ وہ وقت آئے گا کہ ایک بڑھیا سونا اُچھالتی ہوئی عرب کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں نکل جائے گی۔ اور کوئی اُس سے تعرض نہ کرے گا'' پس وہ وقت آ گیا کہ بڑھیا سونا اُچھالتی ہوئی ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں نکل گئی اور کسی نے اُس سے تعرض نہ کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اسلام نے حکومت اسلامی کا جو جمہوری نظام ترتیب دیا۔ وہ ایک ایسی چیز تھی جو اُس کے گرد و پیش کے نظاماتِ حکومت میں کہیں بھی موجود نہ تھی اُس نے ایک باقاعدہ قانونی اور جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی حقوق عامہ کا تعین کیا۔ تعزیرات و جرائم کی حدود قائم کیں، مالی، ملکی اور

انتظامی قوانین وضع کیے۔ عدل و انصاف کی تعلیم دی۔ اور شخصی حکومت و ذاتی امتیازات کو ایک قلم مٹا دیا۔

ایک بہتر سے بہتر حکومت کے تخیل کے لوازم کیا ہیں؟ اس کے جواب میں ہمارا موجودہ سیاسی لٹریچر اُس دستور سے بہتر کوئی دستور پیش نہیں کر سکتا جو انقلاب فرانس کے شدائد اور مصائب کے بعد اٹھارویں صدی میں مرتب ہوا اور جس پر آج جمہوری حکومتوں کا عمل ہے۔ یعنی ''حکومت جمہور کی ملکیت ہے۔ وہ ذاتی یا خاندانی ملکیت نہیں، تمام اہل ملک ہر قسم کے حقوق و قانون میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ رئیس ملک یعنی پریزیڈنٹ جس کو اسلام کی اصطلاح میں خلیفہ کہتے ہیں اُس کا تقرر رائے عامہ سے ہو اور اُمورِ انتظامی و قانونی ملک کے اہل الرائے اشخاص کے مشورے سے انجام پائیں۔ خزانہ ملکی باشندگان ملک کی ملکیت ہو۔ رئیس کو بغیر اجازت عوام اُس پر تصرّف کا کوئی حق حاصل نہ ہو''۔

یہ ہے زمانہ حاضرہ کی جمہوریت کا خاکہ جو تمام تر اسلام سے مستعار لیا گیا ہے۔ اسلام میں حکومت جمہور کی ملکیت ہے۔ وہ کسی خاص شخص کی ذاتی یا خاندانی ملکیت نہیں قرآن مجید کا یہ حکم ہر شخص کو معلوم ہے۔

اُمور حکومت میں اے نبی مسلمانوں سے مشورہ لے لیا کرو۔

اس آیت سے یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ حکومت اسلامیہ میں مشورہ عام شرط ہے جو جمہوری حکومت کی بنیاد ہے۔ چناں چہ اسلامی حکومت کی یہ خصوصیات ہیں۔

(۱) آنحضرت صلعم نے اور خلفائے راشدین نے اپنا جانشین کسی عزیز یا اپنے بیٹے کو نہیں بنایا۔

(۲) تمام معاملات ضروری میں آنحضرت اور خلفائے راشدین مہاجرین و انصار سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً مشورہ لیتے تھے۔

(۳) خلفاء کا تقرر عموماً مشورہ عام سے ہوتا تھا۔

(۴) بیت المال پر عام مسلمانوں کا حق تھا۔ کبھی ذاتی طور پر اس کو صَرف میں نہیں لایا گیا۔

یہی دنیا کا سب سے پہلا بنیادی جمہوری نظام تھا۔ جس سے بعد کو ساری دنیا نے فائدہ اُٹھایا۔ درحقیقت یہ اسلام کی واضح ترین خصوصیت ہے کہ اُس کی نظر میں آقا اور غلام، معزز اور حقیر، چھوٹا اور بڑا، امیر اور فقیر سب برابر ہیں۔ صہیب اور بلال جو آزاد شدہ غلام تھے۔ سردارانِ قریش کے پہلو بہ پہلو اُن کا نام ہے۔ اسلام کے سامنے صرف ایک ہی چیز ہے جس سے انسانوں کے باہمی رُتبہ میں تفریق ہو سکتی ہے یعنی تقویٰ اور حُسنِ عمل۔

''تم میں زیادہ معزز وہی ہے جو زیادہ متقی ہے''

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک فقرے میں مراتب کی تفریق کردی۔ آپ نے فرمایا

''بزرگی اور بڑائی صرف تقویٰ اور حُسنِ عمل سے ہے۔'' (ترمذی)

پھر ارشاد ہوتا ہے

''تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنا تھا۔ پس سب آپس میں برابر ہیں۔'' (مشکوٰۃ)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی کا کرشمہ تھا۔ جس نے فرعون اور نمرود کے دورِ استبداد کو ختم کر کے کُل بنی نوع انسان کو ایک صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اور دنیا کے سامنے ایک ایسا کامل ترین جمہوری نظام حکومت پیش کیا جس سے دنیا قیامت تک استفادہ کرتی رہے گی۔

دین دنیا دہلی دسمبر ۱۹۵۵ء

☆☆☆

اسلام نے ظالموں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا

اسلام ساری دنیا کے لیئے نجات کا پیغام لے کر آیا ہے

دنیا میں آج جو بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں اُن کو دو قسموں میں منقسم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ سلسلہ ہے جس کے ماتحت یہودی اور مسیحی قومیں اب تک دنیا میں باقی ہیں ۔ دوسرا آرین سلسلہ ہے جس سے گوتم بدھ اور ہندوستان کے تمام داعیانِ مذاہب وابستہ ہیں، یہودی مذہب کی تاریخ میں دنیا کے سب سے بڑے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، حضرت موسیٰ کی حیاتِ مقدسہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مصر کی ایک جابر اور ظالم حکومت کے پنجۂ استبداد سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی ، بلاشبہ اُنھوں نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے بڑا ہی مقدس جہاد کیا، لیکن سوال یہ ہے کہ اُنھوں نے تمام دنیا کے لیے کیا کیا؟ دنیا صرف بنی اسرائیل ہی کا نام نہیں ہے، غیر الٰہی عبودیت کی زنجیریں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاؤں میں نہیں تھیں ۔ بلکہ کرۂ ارضی کی تمام آبادی کے پاؤں اس کے بوجھ سے زخمی تھے پس دنیا کے لیے وہی تلوار محبوب ہوسکتی ہے جو صرف فرعونِ مصر کی ڈالی ہوئی زنجیروں کو نہ کاٹے بلکہ دنیا کے تمام فرعونوں کے تختِ غرور کو اُلٹ دے یہ تلوار اسلام کی تھی جس نے کہ بلا امتیاز مذہب وملت کل نوعِ انسانی کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور دنیا کو اُن مصیبتوں سے نجات دلائی جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کرۂ ارضی کی تمام آبادی زمانہ دراز سے بے قرار تھی۔

مسیحی دعوت کی تعلیم بھی ہمارے سامنے ہے حضرت مسیح نے کہا کہ صرف تورات کو قائم کرنے آیا ہوں خود کوئی نئی دعوت نہیں لایا، اُنھوں نے تصریح کی کہ میرا مشن صرف بنی اسرائیل کی

اصلاح تک محدود ہے ۔ نیز اُنھوں نے غیر قوموں میں منادی کرنے سے روکا اور ہمیشہ اپنے کاموں اور تعلیم کو اسرائیل کے گھرانے تک ہی محدود رکھا، دراصل انھوں نے جو کچھ بھی خدمت کرنی چاہی وہ محض بنی اسرائیل نامی مسخ شدہ قوم کی تھی ۔ تمام دنیا کے لیے اُن کے پاس کچھ نہ تھا پھر اُن کا ظہور اُس وقت ہوا جب کہ روم کی ظالمانہ حکومت نے شام کے مقدس مرغزاروں کو روند ڈالا تھا ۔ اور بُت پرستوں کی جابر طاقتیں دنیا کے بڑے حصہ کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھیں ۔ لیکن انھوں نے نہ تو اس ظلم وطغیان کے متعلق کچھ کہا، اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا، اس کے برخلاف اسلام اُن تمام ظالم وجابر طاقتوں کے مقابلہ میں صف آراء ہوگیا جنھوں نے نوعِ انسانی کو کچل رکھا تھا۔ اور اللہ کی مخلوق کو پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا تھا۔ اسلام نے جلوہ گر ہو کر کسی خاص قوم یا جماعت تک اپنے فیوض کو محدود نہیں رکھا وہ کُل نوعِ انسانی کے لیے رحمتِ کبریٰ ثابت ہوا۔

اگر غور کیا جائے تو پہلی صدی مسیح کے بعد جس قدر مسیحی قومیں دنیا میں آباد ہوئیں، اُن کو حضرت مسیح کی تعلیم ودعوت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ وہ سرتاسر یونان کے ایک تعلیم یافتہ یہودی پولس کے مذہب کی پیرو تھیں ۔ اس طرح روم ویونان کے مختلف جزیروں اور دیہاتوں میں ایک نیا گروہ پیدا ہوگیا۔ پس اگر دنیا حضرت مسیح کی طرف جھکنا چاہے گی تو دنیا کو اُن کے کارنامۂ حیات کے لیے بمشکل ایک چوتھائی صدی ہاتھ آئے گی، جس کے اندر اُن کے تربیت یافتہ حواریوں کے اعمال نظر آسکتے ہیں اور یہ چند سال بھی فضائل ومحاسن اور اخلاق کا کیسا ہی عمدہ نمونہ کیوں نہ پیش کریں لیکن ان میں دنیا کے لیے اسلام کی طرح کوئی عام پیامِ نجات موجود نہیں، خود حضرت مسیح کا فتویٰ ہے کہ ''تم خدا اور دنیا دونوں کی خدمت ایک ساتھ نہیں کرسکتے ۔'' (متی) ''اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (متی)

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام سے قبل جب تک نام نہاد مسیحت دنیا پر حکمراں رہی

جس وقت تک مسیحی تسلط انسانوں سے اطاعت کراتا رہا اور جب تک دنیا نے مسیحی رہنماؤں اور شہنشاہوں سے انحراف نہیں کیا، اُس وقت تک اُس کا وجود دنیا کے لیے، دنیا کے علم وتمدن کے لیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کی فطری حریت کے لیے ایک مصیبت بنا رہا، اُس نے آبادیوں کو جلایا، ویران کیا، مسمار کیا، قتل کیا، جیل خانے بھرے زبانوں پر مہریں لگائیں، انسانی دماغوں کو معطل کیا لیکن انسانیت کی ترقی کے لیے کچھ نہ کیا، مشہور مورخ گبز، سہدیو، لامارے اور ڈریپر اس بارے میں ہمارے لیے بہترین راوی ہیں۔

اس کے بعد مذاہب عالم میں آرین نسلوں کی دعوتیں ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم الشان گوتم بدھ کی تمام تعلیم اور وصایا کا ماحصل یہ بتلاتا ہے کہ ''نجات دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہوسکتی''، پس دنیا کو جن لوگوں نے ٹھکرایا ہو دنیا اُن کے پاس جا کر کیا سیکھ سکتی ہے۔

پس دنیا اگر اپنی نجات کے لیے بے چین ہے تو اُس کے لیے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے۔ اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے، اُس کا دکھ ایک ہی ہے اس لیے اُس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتے، اُس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے آفتاب کو اُس کے خشک وتر علاقوں پر یکساں چمکاتا ہے اور ایک ہی طرح کی بدلیوں سے آباد و ویران خطوں کو شاداب کرتا ہے پس اُس کی ہدایت ورحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے گو بہت سے ستارے اُس کی روشنی سے اکتسابِ نور کرتے ہیں مگر اُن سب کا مرکزِ نورانیت ایک ہی ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

''اے پیغمبر اسلام، ہم نے تم کو دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے والا، سعادت انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا، اللہ کی طرف اُس کے بندوں کو بُلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا۔''

پس تمام کرہ ارضی کی روشنی کے لیے یہی ایک آفتاب ہدایت ہے جس کی کرنوں کے اندر دنیا اپنی تمام تاریکیوں کے لیے نور بشارت پاسکتی ہے اور اس لیے صرف وہی ہے جسے دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور اگر اُس نے بُھلا دیا ہے تو وہ وقت دور نہیں ہے جب کامل عشق اور شیفتگی کے ساتھ صرف اُسی کے آگے جھکنا پڑے گا، اور اُسی کو اپنا کعبہ اُمید بنانا پڑے گا۔

پیغمبر اسلام جو ساری دنیا کا پیغمبر ہے اُس نے دنیا میں ظاہر ہو کر یہ نہیں کہا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں، بلکہ اُس نے کہا کہ تمام عالم انسانیت کو غیر الٰہی غلامیوں سے نجات دلانا میرا مقصد ظہور ہے اُس نے صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ رونق ہی سے عشق نہیں کیا بلکہ تمام عالم کی اُجڑی ہوئی بستی پر غمگینی کا اظہار کیا، اور دوبارہ اُن کی رونق وآبادی کا اعلان کیا۔ اُس نے اُس خدا کی محبت کی طرف دعوت نہیں دی جو صرف سینا کی چوٹیوں یا ہمالہ کی گھاٹیوں میں بستا ہے، بلکہ اُس رب العالمین کی طرف بُلایا جو تمام نظام ہستی کا پروردگار ہے۔

ہم کو دنیا میں سکندر ملتا ہے جس نے تمام عالم کو فتح کرنا چاہا تھا لیکن ہم دنیا کی پوری تاریخ میں خدا کے کسی ایسے رسول کو نہیں پاتے جس نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا ہو یہ فخر محض پیغمبر اسلام ہی کو حاصل ہے جو ساری دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے ہیں اُن کا صرف ایک ہی اعلان ہے جو آغاز خلقت سے اب تک کیا گیا ہے یعنی نوعِ انسانی کی نجات اس لیے اگر دنیا نسلوں، قوموں، اور رقبوں کا نام نہیں ہے بلکہ مخلوقات الٰہی کی اِس پوری نسل کا نام ہے جو کرہَ ارضی کی پیٹھ پر بستی ہے تو مجبور ہے کہ ہر طرف سے مایوسی کی نظریں ہٹا کر صرف اُس ایک ہی اعلان عام کے آگے جھک جائے۔

دنیا میں جس قدر داعیان حق وصداقت کے اعلانات موجود ہیں اگر دنیا اُن کو بھلادے گی تو یہ صرف قوموں اور ملکوں کی سعادت کی فراموشی ہوگی لیکن اگر داعی اسلام کے پیغام کو بُھلا دیا تو یہ

تمام کرۂ ارضی کی نجات کو بھلا دینا ہوگا کیوں کہ دنیا نے ہمیشہ اسی پیغام میں اپنی نجات ڈھونڈھی ہے، اور اسی پیغام سے نوع انسانی نے ہدایت حاصل کی ہے۔

جس وقت ساری دنیا تاریکی اور ضلالت میں مبتلا تھی۔ اسی پیغام نے دنیا کی رہنمائی کی تھی۔ اسی پیغام کے ذریعہ مظلوم اور مجبور انسانوں کے بازوؤں میں وہ طاقت پیدا ہوئی جس نے کہ عہدِ وسطیٰ کے فرعونوں کے قصر کی بنیادوں کو ہلا دیا، اسی پیغام کے ذریعہ انسانیت کی کچلی ہوئی لاش میں ازسرِنو زندگی پیدا ہوئی۔

حق یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا پیغام کسی خاص طبقہ یا خطے کے لیے محدود نہیں ہے، اس میں اُن کے لیے بھی نجات ہے، جو اسلام کے پیرو ہیں اور اس میں اُن کے لیے بھی سامانِ ہدایت ہے، جو حلقہ بگوش اسلام نہیں ہیں، کیوں کہ پیغمبر اسلام کی رحمت کسی ایک نسل، قوم یا سرزمین کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام عالمین کے لیے ہے۔

دین دنیا دہلی   اپریل ۱۹۵۷ء

☆☆☆

اسلام ہی دنیا کو تباہی سے بچا سکتا ہے

آج ساری دنیا کو پھر اسلام کی ضرورت ہے

آج دنیا پھر تاریک ہے وہ روشنی کے لیے پھر تشنہ ہے وہ پھر سوگئی ہے۔ جس نیند سے کہ اُسے بار بار جگایا گیا تھا۔ اور پھر اُسے بھول گئی ہے۔ جس کی تلاش میں بار بار نکلی تھی اور جس کو چھٹی صدی عیسوی میں اللہ کے ہاتھوں سے اسلام کا آخری مرہم نصیب ہوا تھا، آج پھر تازہ ہو گیا ہے، جو تاریکی کہ چھٹی صدی عیسوی میں جہالت نے پھیلائی تھی جب کہ اسلام کا ظہور ہوا تھا ویسی ہی تاریکی آج تہذیب وتمدن کے نام سے پھیل رہی ہے، اگر اُس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی بت پرستی تھی تو اُس کی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا اب خود اپنے آپ کو پوجتا ہے، خدا کی پرستش اُس وقت بھی نہ تھی اور اُس کے پوجنے والے آج بھی معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دنیا کی کونسی بیماری ہے جو آج پھر عود کر نہیں آئی ہے؟ جب کہ وہ چھٹی صدی عیسوی بیمار تھی تو کیا اُس کی حالت ایسی ہی نہ تھی جیسی کہ آج ہے؟ پہلے وہ پتھر کی چٹان پر بیماری کی حالت میں کروٹیں بدلتی ہوگی اور اب چاندی اور سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے، مگر بیمار کے بستر کے بدل جانے سے بیمار کی حالت نہیں بدل سکتی۔

جنسی اور نسلی تعصّبات کروڑوں طاقتور انسانوں کو اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں، ضعف اور کمزوری سے بڑھ کر قوموں اور ملکوں کا کوئی جرم نہیں۔ ہر قوم جو طاقت رکھتی ہے خدا کی تمام دنیا کو صرف اپنے ہی لیے سمجھتی ہے اور وہ اُس کے کمزور بندوں کے لیے عدالت کے ایک جج کی طرح

موت کافتوی صادر کرنے میں بالکل بے باک ہے حق اور عدالت کے الفاظ لفظ جس قدر زیادہ دہرائے جارہے ہیں معنًا اتنے ہی متروک ہوگئے ہیں اور نوع انسانی کی مساوات اور انسیت کی حقیقت قوت وطاقت کے ہاتھوں پامال ہورہی ہے۔

یہ سب کچھ جہالت کے سائے میں نہیں ہورہا بلکہ علم ومذہبیت کے گھمنڈ میں ہورہا ہے۔ بیماری وہی پرانی ہے جس نے خاک وگرد پر دنیا کو تڑپایا تھا، البتہ اب وہ سنہری پلنگ پر لیٹ گئی ہے اور موتیوں کے پردے چاروں طرف گرادیے گئے ہیں۔

ایسا ہونا ضروری ہے کیوں کہ اور پرہیزگاری کا چشمہ خشک ہوگیا ہے اور وہ نالیاں مٹی سے بھرگئی ہیں جن کی آب پاشی سے آج سے چودہ سو برس قبل خدا پرستی کا چمن شاداب ہوا تھا، پس وقت آگیا ہے کہ اسلام پھر ایک مرتبہ اپنے اُس فرض کو دہرائے جو وہ ایک مرتبہ انجام دے چکا ہے۔اور مسلمان اپنی اصلاح خود اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے کریں تاکہ اُن کی درستگی سے تمام عالم درست ہو، اور اسلامی چشمہ کی روانی سے سارا عالم سرسبز ہوجائے۔

اسلام کو پھر ایک بار اُس عادلانہ نظام کو دنیا سے روشناس کرنا ہے جس نے کہ پریشان حال دنیا کو امن وسکون عطا کیا تھا انسان کی عالمگیر اخوت کی راہ میں سب سے بڑی روک چار چیزیں ہیں، نسل، وطن، رنگت، زبان، ان چار امتیازات کی بنا پر الگ الگ حلقے بن گئے تھے، اور انسانیت کا دائرہ بے شمار چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹ گیا تھا، اسلام نے ان چاروں سے انکار کردیا نسل کی نسبت صاف کہہ دیا کہ سب کی نسل ایک ہے، وطن کی نسبت کہہ دیا کہ عرب ہو عجمی سب ایک ہی خدا کی زمین کے باشندے ہیں، زبان اور رنگت کی نسبت فیصلہ کردیا کہ یہ خدا کی حکمت وقدرت کی نشانیاں ہیں، کسی جگہ آب وہوا ایک رنگ پیدا کرتی ہے، کہیں کی آب وہوا دوسرا رنگ، کہیں ایک خاص زبان ادائے مطلب کے لیے وجود میں آئی کہیں دوسری زبان لیکن یہ اختلافات انسان کے

امتیاز اور تفرقہ کی بنیاد نہیں ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ہی اسلام نے اپنے اعمال کا جو نظام تیار کیا اس کے ہر گوشہ کی وضع قطع ایسی رکھی جس کے ساتھ ساتھ امتیاز نسل وقوم جمع ہی نہیں ہوسکتا۔یعنی روزانہ کے اعمال وعبادات میں ایسی چیزیں رکھ دی گئیں کہ ہمیشہ ہی انسانی وحدت ومساوات کا عملی اعتراف ہوتا رہے، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج سب ہی میں یہ روح کام کررہی ہے، غرض کہ اسلام انسانی اخوت کے قیام ونفوذ کا مکمل نظام ہے جس کی اگر چھٹی صدی عیسوی میں ضرورت تھی تو اس زمانہ میں شدید ضرورت ہے، کیوں کہ دنیا پھر اُسی تاریکی میں جا پڑی ہے جس تاریکی سے اُسے اسلام نے نکالا تھا۔

اسلام کا مشن ابھی ختم نہیں ہوا ہے، اُس کی تعلیم کی یہ دنیا جس قدر اُس وقت محتاج تھی جب کہ اُس نے چودہ سو برس قبل جزیرہ نمائے عرب میں اپنی صورت دکھائی تھی، اُس سے کہیں زیادہ آج کی دنیا کو اپنے امن ونظام کے لیے اپنی عدالت وصداقت کے قیام کے لیے، اپنی سفاکیوں اور بے رحمیوں کے ازالہ کے لیے اپنی صلح عام کی تحریک اور امنیت عمومی کے ظہور کے لیے اصلاح انسانیت اور استیصال جبر کے لیے، اور سب سے آخر یہ کہ خدا کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر جوڑنے کے لیے دنیا کو صرف اسلام ہی کی ضرورت ہے۔اسلام کے فرزند خواہ اسلام سے بے نیاز ہوگئے ہوں، مگر دنیا کبھی اسلام سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

اسلام کا کام ہے اُمتوں کی اصلاح کرنا، خدا سے اُس کے غافل بندوں کو ملا دینا، اعتقاد واعمال کے عالم کو یکسر پلٹ دینا، نئی قوموں اور نئی جماعتوں کو پیدا کرنا، پھر نتیجہ کی ناکامی سے بے خطر اور تمام قوائے مادیہ سے بے پرواہ رہنا اور اسی طرح کی وہ تمام باتیں جو دلوں اور روحوں کی سرزمین میں انقلاب وتغیر پیدا کردیتی ہیں اُنھیں عمل میں لانا یہ سب کے سب صرف خدا کے رسولوں اور اُس کے بھیجے ہوئے مصلحین کے کام ہیں محض انسانی دماغ سے اُٹھے ہوئے جوش اور انسان کے

گھڑے ہوئے چند جماعتی کھلونے خدا کے ان کاموں کو انجام نہیں دے سکتے۔

اسلام کے اسی انقلابی نظام کو بروئے کار لانے کے لیے پھر مخلصین کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس نے کہ چھٹی صدی عیسوی میں انقلاب برپا کر دیا تھا، تا کہ خدا اور اُس کے سچے بندوں میں عہد و میثاق اسلام کی ایک مرتبہ پھر تجدید ہو جائے کچھ ضروری نہیں کہ اُن کی تعداد زیادہ ہو، کیوں کہ دنیا میں تعداد نہیں بلکہ ہمیشہ صداقت کام کرتی ہے، یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ جاہ و حشمت کے مالک ہوں کیوں کہ صداقت کا گھر ہمیشہ سے خاک و گرد ہی میں رہا ہے۔

ہاں وہ جماعت خواہ تعداد میں کتنی ہی قلیل اور عزت و شوکت دنیاوی کے اعتبار سے کتنی ہی بے حقیقت ہو پر ضروری ہے کہ اُس کا ظاہر جتنا حقیر ہو اُتنا ہی اُس کا باطن عزیز و جلیل ہو، اُن کے چہرے خواہ گرد فلاکت سے اَٹے ہوں پر دل نور صداقت وحق پرستی سے تابندہ درخشاں ہوں اُن کے جسم پر پھٹے ہوئے کپڑے ہوں مگر دوش ہمت پر حکمرانی کی چادروں سے بھی بڑھ کر قیمتی ردائیں پڑی ہوں، وہ پہاڑوں کی چٹانوں سے بڑھ کر محکم ارادہ اور لوہے کے ستونوں سے زیادہ مضبوط ہمت لے کر اٹھیں اور آگے بڑھیں۔

ایسی ہی ایک جماعت نے چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو تاریکی سے نکالا تھا، اور ایسی ہی ایک جماعت کی آج بھی ضرورت ہے، تا کہ دنیا جس پرانی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے اور حالت اضطراب میں کروٹیں بدل رہی ہے اُسے اس بیماری سے نجات ملے۔ اسلام پہلے بھی ملکوں اور قوموں کی اصلاح کے لیے آیا تھا اور آج بھی اسی مقصد کے لیے دنیا کو اسلام کی ضرورت ہے، کیوں کہ اسلام کے انقلابی نظام کے بغیر نہ تو خودی کے بتوں کو توڑا جا سکتا ہے اور نہ انسانیت اور امنیت کے اُس دور کو واپس لایا جا سکتا ہے جس کے دامن میں دنیا نے سکون کا سانس لیا تھا، اسلام چھٹی صدی عیسوی سے لے کر ہمیشہ دنیا کی رہنمائی کرتا رہا ہے اور آج دنیا کو اُس کی رہنمائی کی پہلے سے کہیں

زیادہ ضرورت ہے۔

لیکن جو آتش دان خود آگ سے خالی ہو گا وہ کمرہ کو گرم نہیں کر سکتا اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں، کیوں کہ اُن کی تبدیلی پر تمام عالم کی تبدیلی موقوف ہے وہ سب سے پہلے اپنے دلوں میں گرمی پیدا کریں اور اس کے بعد اس گرمی سے سارے عالم کی رگوں میں حرارت پیدا کریں تا کہ اس حرارت سے پھر ایک بار وہ انقلاب رونما ہو جو چودہ سو برس پہلے رونما ہو چکا ہے۔

دین دنیا دہلی فروری ۱۹۷۴ء

☆☆☆

قرآن کا مقصد

قرآن کہتا ہے دنیا میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی، کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے۔ پس ایک پروردگارِ عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یکجہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون۔۵۲)

اور دیکھو یہ تمھاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور) نافرمانی سے بچو۔

قرآن کہتا ہے، کہ خدا نے تمھیں ایک ہی جامۂ انسانیت دیا تھا، لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے اور رشتہ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی، تمھاری نسلیں بہت سی ہیں اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمھارے وطن بہت سے بن گئے ہیں ۔ اس لیے اختلاف وطن کے بعد ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمھاری قومیتیں بے شمار ہیں ۔ اس لیے ہر قوم دوسری سے دست و گریبان ہو رہی ہے۔ اور تمھارے رنگ یکساں نہیں، اور یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمھاری بولیاں مختلف ہیں، اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے ۔ پھر ان کے علاوہ امیر فقیر، نوکر و آقا ، وضیع و شریف ضعیف و قوی ، ادنیٰ و اعلےٰ ، بے شمار اختلاف پیدا کر لیے گئے ہیں، اور سب کی منشاء یہی ہے کہ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاؤ اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی صورت میں بتلاؤ وہ رشتہ کونسا

رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے۔ اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر از سرِ نو آباد ہو جائے۔

وہ (قرآن) کہتا ہے صرف ایک رشتہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمھارے خدا الگ الگ نہیں ہو سکتے ۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو۔ تم سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی چوکھٹ ہے۔ تمھاری کوئی نسل ہو، تمھارا کوئی وطن ہو، تمھاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمھارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا۔ تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جُڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے، کہ تمام دنیا تمھارا وطن ہے۔ تمام نسلِ انسانی تمھارا گھرانا ہے اور تم سب ایک ہی ربّ العالمین کی عیال ہو۔

تعمیر فکر جون ۱۹۷۲ء

☆☆☆

آہ! وہ دلوں کا سوز و گداز کہاں؟

نماز اسلام کا اہم ترین جزو ہے اور اگر صرف اپنی نمازیں درست و استوار کرلی جائیں تو میں یقین کرتا ہوں کہ دین کی ساری سرافرازیاں اور دنیا کی ساری سربلندیاں حاصل ہوسکتی ہیں مگر افسوس کہ مسلمانوں کی غفلت و جمود نے جہاں اُن کی بداعمالیوں کی پاداش میں اُن سے ہر قسم کی سربلندیاں اور سرافرازیاں چھین لیں وہاں ان کے دلوں کی انگیٹھیاں بھی اس درجہ سرد ہوگئی ہیں کہ ان میں اب کوئی چنگاری اور کوئی گرمی باقی نہیں رہی، دل کا سوز و گداز، اللہ کے حضور جھکنے کا جذبہ، سچا عجز، غرضکہ سب کچھ سرد و محو ہو چکا ہے، کون ہے جو نماز کی صحیح لذت اپنی نمازوں میں پاتا ہے۔ اور جب نماز کی لذت ہی نماز سے علحدہ کرلی گئی تو پھر وہ ایک جسم ہے جس میں جان نہیں، ایک پھول ہے جس میں خوشبو نہیں۔ ایک ڈھانچہ اور ہیولیٰ ہے جس میں رُوح نہیں۔ ایسی نماز بیکار صرف قواعد ہوئی اور صرف ٹکر مارنا، بے نتیجہ، بے فائدہ، بے اثر۔

ایمانی حرارت کا فقدان اور اس کا انجام اگر مسلمان صحیح طور پر نمازی ہوا کرتے ہیں اور ان کی نمازیں، نمازیں شمار ہوتی ہیں تو پھر بتاؤ کہ نماز کے وہ قرآنی برکات جن کا اللہ نے نمازی سے وعدہ کیا ہے کہاں ہیں، کیا! اللہ کا وعدہ غلط ہے؟ ہرگز نہیں، تو کیا پھر ہماری نمازیں، نمازیں نہیں ہیں، یقیناً اللہ کا قانون اٹل اور اس کا وعدہ سچا، ولن تجد لسنة اللہ تبدیلا ولن یخلف اللہ وعدہ، اصل یہ ہے کہ دلوں کے چولھے سرد ہوگئے۔ ان میں کوئی گرمی اب باقی نہیں رہی، کوئی چنگاری، موجود نہ رہی، ورنہ اگر ہماری نمازوں میں سوز و گداز، عجز و الحاح ہوتا تو دنیا اور دنیا کے ساتھ دین کی کامرانیاں ہماری ہوتیں۔

موجودہ مشکلات کا حل صرف نماز میں ہے میں بتاؤں کہ کیوں صرف نماز ہی استواری و درستگی سے ہمارا دین اور ہماری دنیا بدل سکتی ہے سنو! تمام قرآن کی تمام مکّی سورتوں کو پڑھ جاؤ، یعنی جن کا زمانہ نزول، زمانہ قیامِ مکّہ تھا۔ اور رسول کریم صلعم اپنے وطن ہی میں تشریف فرما تھے، اور یہی زمانہ وہ تھا جب دعوت و تبلیغ حق کی پکار مکّہ کے کوہساروں سے شروع شروع ٹکراتی تھی۔ بالکل ابتدائے عالمِ اسلام تھی اس وقت داعی اسلام کی غربت و بیچارگی، بے یاری و بے مددگاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوتی تھی، معدودے چند مسلمان تھے جو ہر طرف اور ہر طرح سے اعدائے اسلام کے نرغے میں محصور تھے، پورا مکّہ اور نہ صرف مکّہ بلکہ پورا جزیرۃ العرب ان کے خون کا پیاسا اور جان کا دشمن تھا یار تھا نہ کوئی مددگار، جس طرف نظر اٹھتی تھی مایوسی سے ٹکراتی ہوئی واپس آتی تھی، جس طرف امان و احسان کی تلاش میں نکلتے تھے مایوسی و حرمانی کے ساتھ واپس آجاتے تھے ایسے ہی عالم کسمپرسی و بیچارگی میں بتاؤ کہ اس وقت ان تمام درد و مصائب کا علاج و نسخہ شفا جو حکیم مطلق نے تجویز کیا تھا وہ کیا تھا؟ اور وہ صرف ایک یعنی اقم الصلوٰۃ، نماز قائم کرو، نماز قائم کرو، حالانکہ اللہ کی اس کشادہ زمین پر ان کو یہ بھی حق نہ تھا کہ کھلے طور پر نماز ہی کے لیے جگہ ملتی، مگر دانائے حال نے بجز اس کے اور کوئی دوسرا نسخہ نہیں تجویز فرمایا، کہ اقم الصلوٰۃ نماز قائم کرو، نماز قائم کرو، یہ اس لیے کہ نماز ہی تمہارے تمام دکھوں کا علاج، ہر درد کی دوا، اور ہر زخم کا مرہم ہے۔

بیچارگی، غربت اور دردِ مسکنت کا علاج وسیع و کشادہ زمین عرب میں سب کے لیے جگہ تھی سب کو چلنے پھرنے کا بلا قید و شرط حق تھا، مگر تنگ تھی وہ زمین، تو ان چند ہی پرستاران حق و توحید کے لیے وہ کونسی جسمانی و روحانی تکلیف و ایذا تھی جو ان کو نہ دی گئی یا ان کے لیے نہ تجویز کی گئی ہو۔ بالآخر جب شدتِ تکالیف و ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی اور انسان کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی حتی کہ وہ وجود اقدس و گرامی باشارہ مالک یوم الدین ہجرت پر مجبور ہوا۔ اور وطن سے بے وطنی پر

لاچار، اس وقت کے کرب والم، دردوغم کے لیے بھی جو داروئے تسکین ومرہم زخم آتا ہے وہ یہی کہ اقم الصلوٰۃ ،نماز قائم کرو،نماز قائم کرو۔

سورۂ ق کی آخری آیات پڑھو،تم کو واضح ہو جائے گا کہ اس بیچارگی ،غربت اور دردو مسکنت کا جو علاج سوچا گیا،اور کامیابی کی جو راہ سوچی گئی تھی وہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ اقم الصلوٰۃ نماز قائم کرو،مگر کاش کبھی تم قرآن پڑھتے بھی،تم نے قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہی نہیں سمجھا،اس کو توریشمی غلافوں اور جزدانوں میں لپیٹ کر طاق میں رکھنے کی چیز سمجھ لیا ہے۔جو کبھی وقت ضرورت کام میں لائی جاتی ہے۔بلاشبہ قرآن رکھنے کی ہی چیز ہے مگر غلافوں میں نہیں دل میں جس کو اللہ تعالےٰ توفیق دے۔غرض کہ انہی معدودے چند مسلمانوں نے نماز سچی نماز اور صرف سچی نماز کی برکت سے جماعت کی شکل اختیار کی اور کس طرح اس ربانی جماعت نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

نماز واقعی کیا چیز ہے؟ ایک وہ انقلاب انگیز نمازیں تھیں۔ایک تمہاری نمازیں ہیں جو دنیا یا دکھاوے کے لیے ادا کی جاتی ہیں،ان نمازوں کا ہونا نہ ہونا برابر،ان کا ادا کرنا نہ کرنا ایک،بتاؤ تمہاری نمازوں میں کوئی لذت ہے جس سے تمہارے دلوں میں سرور اور تازگی پیدا ہوتی ہو،بتاؤ تمہارے دلوں میں کوئی سوز وگداز ہے،دلوں کے چولھے میں کوئی چنگاری باقی ہے ،جو تمھاری آنکھوں سے ہنگام نماز ایک قطرۂ اشک نکالا کرتی ہے،بتاؤ ایسی نمازوں میں کشش ومحبت الٰہی کا کوئی اثر محسوس کرتے ہو؟ اگر نہیں تو پھر تمہاری نمازیں بیکار ہیں،تمہارے سجدے باطل،تمہاری عبادت اکارت ، سچی نماز تو وہ نماز ہے جس سے دل میں سوزوگداز رکوع میں خشوع وخضوع اور سجود میں کیف ولذت حاصل ہو اور تقرب ومعراج الی المحبوب ،جن کی نمازیں سچی نمازیں تھیں ،جنھوں نے اپنی نمازوں میں لذت وچاشنی پائی تھی ،جن کے زبان ولب اس جام شیریں کی لذت سے شادکام تھے،قرآن ان کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ تتجافی جنوبھم عن المضاجع ان کی

پسلیاں نرم ونازک گدیلوں پر سکون وقرار نہیں پاتیں،راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے اللہ کے حضور میں نمازیں قائم کرتے ہیں اس کی رضا کی آرزوئیں اور اس کے وصل کی التجائیں ،ان کی پیشانیاں مصروف سجدہ،ان کی زبانیں تسبیح کناں،ان کے قلوب محولذائذ نماز ہوتے ہیں،کاش تمہیں بھی ایسی نمازوں کی چاٹ پڑتی اور تم سمجھتے کہ نماز واقعی کیا چیز ہے؟

☆☆☆

مقاصد حج

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی ایک مایہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے تمام عبادات واعمال کا ایک مقصد متعین کیا۔ اور اس مقصد کو نہایت صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ نماز کے متعلق تصریح کی: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (نماز ہر قسم کی بداخلاقیوں سے انسان کو روکتی ہے۔)

روزہ کی نسبت بیان کیا: لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (روزے کے ذریعہ تم لوگ پرہیز گار بن جاؤ گے۔)

زکوٰۃ کے متعلق فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا (اُن کے مال و دولت میں سے ایک حصہ بطور صدقہ کے لے لو کیوں کہ تم اُس کے ذریعہ ان کو بخل اور حرص و طمع کی بداخلاقیوں سے پاک و صاف کر سکو گے)۔

اسی طرح خداوند تعالیٰ نے حج کو تمام فوائد و منافع کو بھی نہایت وضاحت سے بیان فرمادیا: یَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَ یَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (حج کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے فوائد کو حاصل کریں اور اُس کے ساتھ ہی چند مخصوص دنوں میں خدا کو یاد کریں)۔

حج اور تجارت بین الملّی: اس آیت میں قرآن حکیم نے جن فوائد کو حج کا مقصد قرار دیا ہے اُن سے اجتماعی واقتصادی فوائد مراد ہیں اور یہ حج کا ایک ایسا اہم مقصد ہے کہ ابتداء میں جب صحابہ کرامؓ نے دینی مقاصد کے منافی سمجھ کر اُسے بالکل چھوڑ دینا چاہا تو اللہ نے ایک خاص آیت نازل

فرمائی لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِنْ رَبِّکُمْ۔

قرآن حکیم کا عام طرز خطاب یہ ہے کہ وہ جزئیات سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا اور اُس کی توجہ ہمیشہ اہم باتوں کی طرف مبذول رہتی ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی تجارت کو حج کا مقصد قرار دیا اور اُس کی تبلیغ اور حوصلہ افزائی فرمائی وہ عرب کی اقتصادی وتمدنی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ عرب اگرچہ ایک بادیہ نشین اور غیر متمدن قوم تھی۔ لیکن معاش کی ضرورتوں نے اُس کو تمدن کی ایک عظیم الشان شاخ تجارت کی طرف ابتدا ہی سے متوجہ کر دیا تھا۔ قریش کے قافلے دور دور تک مال لیجایا کرتے تھے، خود مکہ کے متصل عکاظ اور ذوالحجاز وغیرہ متعدد بازار قائم تھے۔ اور وہ حج کے زمانہ میں اچھی خاصی تجارتی منڈی سجاتے تھے، پس اہل عرب کو نفس تجارت کی طرف متوجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن اسلام جو عظیم الشان و عالمگیر مدنیت پیدا کرنی چاہتا تھا، اُس کی گرم بازاری کے لیے عکاظ اور ذوالحجاز کی وسعت کافی نہ تھی۔ وہ دنیا کی تمام متمدن قوموں کی طرح تجارت بین الاقوام کا مستقل سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب آفتاب اسلام حجاز کی پہاڑیوں سے بلند ہو کر تمام بحر و بر پر چمکنے والا ہے۔

پس اس آیت کریمہ میں جن تجارتی امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ایک وسیع اور بین الملکی تجارت کا قیام ہے، ورنہ اہل عرب جس قسم کی تجارت کرتے تھے وہ تو ہر حالت میں قائم رکھی جاسکتی تھی۔ اور قائم تھی، البتہ تجارت بین الاقوام کا سلسلہ بالکل قیام امن و بساط عدل واجتماع عام پر موقوف تھا۔ اس لیے جب کامل امن وامان قائم ہو گیا اور حج نے راستہ کے تمام نشیب و فراز ہموار کر دیئے، تو اُس وقت خدا نے مسلمانوں کو تمدن کی اس منفعت عظیمہ کی ترغیب عام دی۔

مقاصد اعلیٰ و حقیقت: سفر حج در حقیقت انسانی ترقیوں کے تمام مراحل کا مجموعہ ہے اس کے ذریعہ انسان تجارت بھی کر سکتا ہے، علمی تحقیقات بھی کر سکتا ہے، سیاحت کے فوائد بھی حاصل

کرسکتا ہے، مختلف قوموں کے تہذیب وتمدن سے بھی آشنا ہوسکتا ہے اورملکوں کے مختلف تمدنوں میں باہم ارتباط وعلائق بھی پیدا ہوسکتے ہیں، اشاعت مذہب اور تبلیغ حق ومعروف کا فرض بھی انجام دے سکتا ہے سب سے آخر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام عالم کی اصلاح وہدایت، انسداد مظالم وفتن، قلع قمع مفسدین، اور اعلان جدوجہد فی سبیل الحق والعدالت کے لیے بھی وہ ایک بین المللی مرکز اور مجمع عموم اہل ارض کا حکم رکھتا ہے۔

اُمت مسلمہ: لیکن ان تمام چیزوں سے مقدم اوران تمام ترقیوں کا سنگ بنیاد ایک خاص اُمت مسلمہ اور حزب اللہ کا پیدا کرنا، اوراس کا استحکام ونشوونما تھا، حضرت ابراہیمؑ واسمٰعیل علیہم السلام نے حج کا مقصد اولین اسی کو قرار دیا تھا۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ہ (خدایا ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمتِ مسلمہ پیدا کر اور ہمیں اُس کے مناسک کی ہدایت فرما اور اگر ہم سے اس فرماں برداری میں لغزش ہو تو اُس کو معاف فرما کیونکہ تو بڑا مہربان اور معاف کرنے والا ہے)۔

اس بنا پر اس قوم کے پیدا ہونے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مذہبی رابطہ اتحاد کے سررشتہ کو مستحکم کیا: إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ط يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ط (جب کہ ابراہیمؑ سے اُس کے خدا نے کہا کہ صرف ہماری ہی فرماں برداری کرو۔ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ میں مسلم ہوا پروردگار عالم کے لیے۔ اور پھر اُسی طریقہ اسلامی کی اُنہوں نے اور یعقوبؑ نے اپنی نسل کو وصیت کی اور کہا۔ خدا نے تمھارے لیے ایک برگزیدہ دین منتخب کردیا ہے۔ تم اُس پر عمر بھر قائم رہنا اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا ہے۔

نشاۃ اولیٰ: لیکن جماعت عموماً اپنے مجموعہ عقائد کو مجسم طور پر دنیا کی فضائے بسیط میں دیکھنا چاہتی ہے اور اُس کے ذریعہ اپنی قومیت کے قدیم عہد مودت کو تازہ کرتی ہے۔ اس لیے اُنہوں نے اس نشاۃ جدیدہ پر قومیت کے ظہور وتکمیل کے لیے نہایت مقدس اور وسیع آشیانہ تیار کیا۔

إِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط (جب ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہم السلام) خانہ کعبہ کی بنیاد ڈال رہے تھے تو یہ دُعا اُن کی زبانوں پر تھی۔ ''خدایا ہماری اس خدمت کو قبول کر، تو دُعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔'' یہ صرف اینٹ پتھر کا گھر نہ تھا بلکہ ایک روحانی جماعت کے قالب کا آب وگل تھا۔ اس لیے جب وہ تیار ہوگیا تو اُنہوں نے اس جماعت کے پیدا ہونے کی دُعا مانگی۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔ اور جب قوم پیدا ہوگئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس روحانی سرشتۂ حیات کو اُس کے حوالہ کردیا۔ اور جب یہ جماعت دنیا میں موجود نہ رہی اور اس کے آثار صالحہ کو زمانہ نے بے اثر کردیا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۔ (وہ قوم گذرگئی اُس نے جو کام کیے اُس کے نتائج اُس کے لیے تھے اور تم جو کچھ کروگے اُس کے نتائج تمھارے لیے ہوں گے۔) لیکن اُس کی ترتیب ونشوونما کا عہد قدیم اب تک دستبرد زمانہ سے بچا ہوا تھا، اور اپنے آغوش میں مقدس یادگاروں کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتا تھا۔ اُس کے اندر اب تک آبِ زمزم لہریں لے رہا تھا، صفا ومروہ کی چوٹیوں کی گردنیں اب تک بلند تھیں، مذبح اسمٰعیلؑ اب تک مذہب کے گرم خون سے رنگین تھا، حجر اسود اب تک بوسہ گاہِ خلق تھا۔ مشاعر ابراہیمؑ اب تک قائم تھے، عرفات کے حدود میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، غرض کہ اُس کے اندر خدا کے سوا، سب کچھ تھا اور اُسی کے جمال جہاں آراء کی کمی تھی۔ اس لیے اُس کی تجدید وتنخ روح کے لیے ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی دُعا کا سب سے آخری نتیجہ ظاہر ہوا۔ اُنہوں نے کعبۃ اللہ کی بُنیاد رکھتے ہوئے دُعا کی تھی

۔رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ط (خدایا ان کے درمیان انہی لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیج کہ وہ ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سُنائے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ اور اُن کے نفوس کا تزکیہ کرے۔ تو بڑا صاحب اختیار اور صاحب حکمت ہے۔)

چناں چہ اُس کا ظہور، وجودِ مقدس حضرت رحمۃ للعلمین ختم المرسلین علیہ الصلوۃ والسلام، کی صورت میں ہوا۔ آپ ٹھیک ٹھیک اس دُعا کا پیکر ومثل تھے۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط (خدا جس نے ایک غیر متمدن قوم میں سے اپنا ایک رسولؐ پیدا کیا اور جو اللہ کی آیات اُس کو سُناتا ہے، اُس کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

پس انہوں نے جو قوم پیدا کردی تھی اُس میں سے ایک پیغمبر اُٹھا۔ اُس نے اس گھر میں سب سے پہلے خدا کو ڈھونڈھنا شروع کیا۔ لیکن وہ اینٹ پتھر کے ڈھیر میں بالکل چھپ گیا تھا، فتح مکہ نے اس انبار کو ہٹا دیا تو خدا کے نور سے قندیلِ حرم پھر روشن ہوگئی وہ قوم جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی تھی اس پیغمبر کے فیضِ صحبت سے بالکل مزکیٰ وتربیت یافتہ ہوگئی تھی۔ اب ایک مرکز پر جمع کر کے اُس کے مذہبی جذبات کو صرف جلا دینا باقی تھا۔ چناں چہ اُسے خانہ کعبہ کے اندر لا کر کھڑا کر دیا گیا اور اُس کی مقدس قدیم مذہبی یادگاروں کی تجدید واحیاء سے اُس کے مذہبی جذبات کو بالکل پختہ ومستحکم کردیا۔

کبھی اُن سے کہا گیا۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ط (صفا اور مروہ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاریں ہیں، پس جو لوگ حج یا عمرہ کرتے ہیں اُن پر دونوں کے درمیان طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔) کبھی اُن کو مشعرِ حرام

کی یاد دلائی گئی۔ فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ط (جب عرفات سے لوٹو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے نزدیک خدا کی یاد کرو۔

خانہ کعبہ خود دُنیا کی سب سے قدیم یادگار تھی لیکن اُس کی ایک ایک یادگار کو نمایاں تر کیا گیا ۔فِيهِ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ ط (اُس میں بہت سی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں منجملہ اُن کے ایک حضرت ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ لیکن جو لوگ خدا کی راہ میں ثابت قدم رہے، اُن کے نقش پا سجدہ گاہ خلق ہونے کے مستحق تھے۔ اس لیے حکم دیا گیا۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (اور ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنی سجدہ گاہ بنالو۔)

مادی یادگاروں کی زیارت صرف سیر وتفریح کے لیے کی جاتی ہے لیکن روحانی یادگاروں سے صرف دل کی آنکھیں ہی بصیرت حاصل کرسکتی ہیں اس لیے اُن کے ادب واحترام کو اتقاء وتبصر کی دلیل قرار دیا گیا۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ط (جو لوگ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاروں کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ تعظیم اُن کے دلوں کی پرہیزگاری پر دلالت کرتی ہے) وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ط (اور جو شخص خدا کی قرار دی ہوئی قابلِ ادب چیزوں کا احترام کرتا ہے تو خدا کے نزدیک اُس کا نتیجہ اُس کے حق میں بہتر ہوتا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقدس یادگاروں کے اثر ونفوذ کو دلوں میں جذب کرا دینا چاہتے تھے اس لیے خاص طور پر لوگوں کو اُن کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے۔ هٰذِهٖ مَشَاعِرُ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ ط (خوب غور سے دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔ کیوں کہ یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کی یادگاریں ہیں۔)

اعلانِ تکمیل: جب اسلام نے اس جدید النشاۃ وجود کی تکمیل کردی اور خانہ کعبہ کی ان مقدس یادگاروں کی روحانیت نے اس کی قومیت کے شیرازہ کو مستحکم کردیا تو پھر ملت ابراہیمیؑ کی

فراموش کردہ روش دکھادی گئی۔وَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ط
(پس ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرو۔جو صرف ایک خدا کے ہو رہے تھے۔)

اب تمام عرب نے ایک خط مستقیم کو اپنا مرکز بنالیا اور قدیم خطوط منحنیہ حرف غلط کی طرح مٹا دیے گئے۔جب یہ کچھ ہو چکا تو خداوند ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا احسان پورا ہو گیا۔اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِينًا ط آج میں نے تمھارے اس دین کو کامل کر دیا جس نے تم کو ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک کر دیا ہے۔اور اپنے تمام احسانات تم پر پورے کر دیے۔اور تمھارے لیے صرف ایک دین اسلام ہی کو منتخب کیا۔

تاریخ فرضیت حج: اہل عرب نے اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجموعہ تعلیم ہدایت کو بالکل بھلا دیا تھا،لیکن انہوں نے خانہ کعبہ کے کنگرے پر چڑھ کر تمام دنیا کو جو دعوت عام دی تھی اُس کی صدائے بازگشت اب تک عرب کے در و دیوار سے آ رہی تھی۔وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ط وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَاْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ط اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ایک معبد قرار دیا،اور حکم دیا کہ ہماری قدسیت و جبروت میں اور کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور اس گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ پاک و مقدس رکھنا،نیز ہم نے حکم دیا کہ دنیا میں حج کی پکار بلند کر،لوگ تمھاری طرف دوڑتے چلے آئیں گے،اُن میں پیادہ پا بھی ہوں گے اور وہ بھی جنھوں نے مختلف قسم کی سواریوں پر دور دراز مقامات سے قطع مسافت کی ہوگی۔

بدعات و محدثات جاہلیہ: لیکن سچ کے ساتھ جب جھوٹ مل جاتا ہے تو وہ اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے اہل عرب نے اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی اس سُنت قدیمہ کو اب تک زندہ رکھا تھا،لیکن بدعات و اختراعات کی آمیزش نے اصل حقیقت کو بالکل گم کر دیا تھا۔

(۱) خدا نے اپنے گھر میں حضرت ابراہیمؑ کو قیام کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا،اَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا ، لیکن اب خدا کا یہ گھر تین سو ساٹھ بُتوں کا مرکز بن گیا تھا اور ان کا طواف کیا جاتا تھا۔

(۲) خدا نے حج کا یہ مقصد قرار دیا تھا کہ دُنیوی فوائد کے ساتھ خدا کا ذکر قائم کیا جائے،لیکن اب وہاں آباواجداد کے کارنامہ ہائے فخر و غرور کے ترانے گائے جاتے تھے۔

(۳) حج کا ایک مقصد تمام انسانوں میں مساوات قائم کرنا تھا اسی لیے تمام عرب بلکہ تمام دنیا کو اس کی دعوت عام دی گئی اور سب کو وضع و لباس میں متحد کر دیا گیا،لیکن قریش کے غرور و فضیلت نے اپنے لیے بعض خاص،امتیازات قائم کر لیے تھے،جو اصول مساوات کے بالکل منافی تھے مثلاً تمام عرب عرفات کے میدان میں قیام کرتے تھے لیکن قریش مزدلفہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متولیان حرم،حرم کے باہر نہیں جا سکتے،جس طرح آج کل کے امراء اور والیان ریاست عام مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں آکر بیٹھنے اور دوش بدوش کھڑے ہونے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

(۴) قریش کے سوا تمام مرد و زن برہنہ طواف کرتے تھے ستر عورت کے ساتھ صرف وہی لوگ طواف کر سکتے تھے جن کو قریش کی طرف سے کپڑا ملتا تھا،اور قریش نے اس کو اپنی اظہار سیادت کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا۔

(۵) عمرہ گویا حج کا ایک مقصد یا جُز تھا لیکن اہل عرب ایام حج میں عمرہ کو سخت گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جب حاجیوں کی سواریوں کی پُشت کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینہ گزر جائے تب عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔

(۶) حج کے تمام ارکان اجزاء میں یہودیانہ رہبانیت کا عالمگیر مرض جاری و ساری ہو گیا تھا اپنے

گھر سے پا پیادہ حج کرنے کی منت ماننا، جب تک حج ادا نہ ہو جائے خاموش رہنا، قربانی کے اونٹوں پر کسی حالت میں سوار نہ ہونا، ناک میں نکیل ڈال کر جانوروں کی طرح خانہ کعبہ کا طواف کرنا، زمانہ حج میں گھر کے اندر دروازہ کی راہ سے نہ گھسنا بلکہ پچھواڑے کی طرف سے دیوار پھاند کے آنا، در و دیوار پر قربانی کے جانوروں کے خون کا چھاپہ لگانا عرب کا عام شعار ہو گیا تھا۔

ظہور اسلام اور تزکیۂ حج: اسلام درحقیقت دین ابراہیمی کی حقیقت کی تکمیل تھا، اس لیے وہ ابتدا ہی سے اس حقیقت گم شدہ کی تجدید و احیاء میں مصروف ہو گیا، جس کا قالب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں نے تیار کیا تھا اسلام کا مجموعہ عقائد و عبادات صرف توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے مرکب ہے، لیکن ان تمام ارکان میں حج ہی ایک ایسا رکن ہے جس سے اس تمام مجموعہ کی ہیئت ترکیبی مکمل ہو جاتی ہے، اور یہ تمام ارکان اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو صرف خانہ کعبہ کے ساتھ ہی متعلق کر دیا۔ اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّتِىْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَىْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ط (مجھ کو صرف حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے خدا کی عبادت کروں جس نے اُسے عزت دی سب کچھ اُسی خدا کا ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اسی کا فرماں بردار مسلم بنوں۔)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ط (اور ہر ایک امت کے لیے ہم نے قربانی قرار دی تھی تا کہ خدا نے اُن کو جو چار پائے بخشے ہیں اُن کی قربانی کے وقت خدا کا نام لیں، پس تم سب کا خدا ایک ہی ہے اُسی کے تم سب فرماں بردار بن جاؤ اور خدا کے خاکسار بندوں کو حج کے ذریعہ دین حق کی بشارت دو۔)

اجزاءِ حج: اور جب ''اُمت مسلمہ'' کے ظہور کا وقت آ گیا۔ اور وہ رسول مزکی و موعود غار حرا کے تاریک گوشوں سے نکل کر منظر عام پر نمودار ہوا، تا کہ اُس نے خود اسی اندھیرے میں جو روشنی دیکھی ہے وہ روشنی تمام دنیا کو دکھلا دے۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ط (بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور ہدایت اور ایک کھلی کھلی ہدایتیں دینے والی کتاب آئی ہے۔)

وہ منظر عام پر آیا تو سب سے پہلے اپنے باپ کے موروثی گھر کو ظالموں کے ہاتھ سے واپس لینا چاہا، لیکن اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرح بتدریج چند روحانی مراحل سے گزرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اُس نے بتدریج ان مرحلوں سے گزرنا شروع کیا۔ اُس نے غارِ حرا سے نکلنے کے ساتھ ہی توحید کا غلغلہ بلند کیا، کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو عہد لیا تھا اُس کی پہلی شرح یہی تھی اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا پھر اُس نے صفِ نماز قائم کی کہ یہ گھر صرف خدا کے آگے سر جھکانے والوں کے لیے بنایا گیا ہے، وَطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ اس نے روزہ کی تعلیم دی کہ وہ شرائط حج کا جامع و مکمل تھا۔ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ (جس شخص نے مہینوں میں حج کا عزم کر لیا تو اُس کو ہر قسم کی نفس پرستی، بدکاری اور جھگڑے تکرار سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔)

اور روزہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسان کو غیبت، بہتان، فسق و فجور، مخاصمت، تنازعت اور نفس پرستی سے روکتا ہے۔ جیسا کہ احکام صیام میں فرمایا گیا۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ۔ (پھر رات تک روزہ پورا کرو اور روزہ کی حالت میں عورتوں کے نزدیک مت جاؤ۔ اور اگر مساجد میں اعتکاف کرو تو شب کو بھی اُن سے الگ رہو۔)

اُس نے زکوٰۃ بھی فرض کر دی کہ وہ بھی حج کا ایک اہم مقصد تھا۔ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا

لُبَائِسَ الْفَقِیْرَ۔ (قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور فقیروں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ)۔

فتح مکہ: اس طرح جب اس اُمت مسلمہ کا روحانی خاکہ تیار ہوگیا تو آپؐ نے اس اُمت مسلمہ کو منظر عام پر نمایاں کرنا چاہا اور اس غرض سے آپؐ نے عمرہ کی تیاری کی اور ۱۴، ۱۵سو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے کہ پہلی بار اپنے آبائی گھر کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر چلے آئیں، لیکن یہ کاروان ہدایت راستہ ہی میں روک دیا گیا.....دوسرے سال حسبِ شرائطِ صلح زیارت کعبہ کی اجازت ملی اور آپؐ مکہ میں قیام کرکے چلے آئے اب اس مصلحت نے راستہ کے تمام نشیب و فراز ہموار کردیئے تھے اور صرف خانہ کعبہ میں پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا، اُسے بھی فتح مکہ نے ہموار کردیا۔

دَخَلَ النبی صلی اللّٰہ عَلَیہِ وَ سَلم مکۃ یوم الفتح وحول البیت ستون وَثلث مائۃ نصیب فجعل بعتطھا بعود فی یدہ ویقول جَاءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا۔ (آنحضرتؐ جب فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو اُس کے گرد ۳۶۰ بُت نظر آئے آپ اُن کو ایک لکڑی کے ذریعہ ٹھکراتے تھے اور یہ آیۃ پڑھتے جاتے تھے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا۔ یعنی حق اپنے مرکز پر آگیا، اور باطل نے اُس کے سامنے ٹھوکر کھائی۔ باطل پامال ہونے ہی کے قابل تھا۔

فرضیت حج: اب میدان بالکل صاف تھا، راستہ میں ایک کنکری بھر سدِّ راہ نہیں ہوسکتی تھی، باپ نے گھر کو جس حالت میں چھوڑا تھا، بیٹے نے اُسی حالت میں اُس پر قبضہ کرلیا۔ تمام عرب نے فتح مکہ کو اسلام کا معیار صداقت قرار دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اب وقت آگیا تھا کہ دنیا کو اس جدید النشاۃ اُمت مسلمہ کے قالب روحانی کا منظر عام طور پر دکھا دیا جاتا، اسی لیے دوبارہ اس دعوت عامہ کا اعادہ کیا گیا جس کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام عالم میں غلغلہ ڈال دیا تھا۔ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حَجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ

سَبِیْلًا۔ (جو لوگ مالی اور جسمانی حالت کے لحاظ سے حج کی استطاعت رکھتے ہیں اُن پر اب حج فرض کردیا گیا ہے۔)

تکمیل حج: اس صدا پر تمام عرب نے لبیک کہا اور آپؐ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہؓ کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ کی طرف چلے، عرب نے ارکان حج میں بدعات واختراعات کا جو زنگ لگا دیا تھا وہ ایک ایک کرکے چھڑا دیا گیا، آبا و اجداد کے کارناموں کے بجائے خدا کی توحید کا غلغلہ بلند کردیا۔ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ آبَاءَکُمْ اَوْاَشَدَّ ذِکْرًا۔ زمانہ حج میں خدا کو اسی جوش وخروش سے یاد کرو جس طرح اپنے آباواجداد کے کارناموں کا اعادہ کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ۔

قریش کے تمام امتیازات مٹا دیے گئے تمام عرب کے ساتھ اُن کو بھی عرفات کے ایک گوشہ میں کھڑا کردیا گیا۔ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوْا اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (اور جس جگہ سے تمام لوگ روانہ ہوا کریں تم بھی روانہ ہوا کرو اور فخر وغرور کی جگہ خدا سے مغفرت مانگو، کیوں کہ خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔)

سب سے بدترین رسم برہنہ طواف کرنے کی تھی اور مردوں سے زیادہ حیاسوز نظارہ برہنہ عورتوں کے طواف کا ہوتا تھا لیکن ایک سال پہلے ہی اس کی عام ممانعت کردی گئی: انا باھریرہ رضی اللّٰہ عنہ اخبرہ ابوبکر صدیق رضی اللّٰہ عنہ بعثہ فی الحجۃ التی امرہٗ رسول اللّٰہ قبل حجۃ الوداع یوم النحر فی رھط یوذن فی الناس الا لاحج بعد العام مشرکٌ وَلا یطوف بالبیت عریان۔ (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنایا۔ اور اُنہوں نے مجھ کو ایک گروہ کے ساتھ روانہ کیا تاکہ یہ اعلان کردیا جائے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ شخص حج یا طواف نہ کرسکے گا۔)

زمانہ حج میں عمرہ کرنے والوں کو فاسق و فاجر کہا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عمرہ ہی کا احرام باندھا اور صحابہ کرام ؓ کو عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ پا پیادہ اور خاموش حج کی ممانعت کی گئی۔ قربانی کے جانوروں پر سوار ہونے کا حکم دیا، ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرنے سے روکا گیا۔ گھر میں دروازہ سے داخل ہونے کا حکم ہوا۔ لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاتُوالۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُھُوۡرِھَا وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰیۚ وَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِھَا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ۔ (یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ گھروں میں پچھواڑے سے آؤ، نیکی تو صرف اس کی ہے جس نے پرہیزگاری اختیار کی، پس گھروں میں دروازہ ہی کی راہ سے آؤ، اور خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔)

قربانی کی حقیقت واضح کی گئی اور بتایا گیا کہ وہ صرف ایثارِ نفس اور فدویت جان و روح کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ اُس کا گوشت یا خون خدا تک نہیں پہنچتا کہ اُس کے چھاپے سے دیواروں کو رنگین کیا جائے، خدا تو صرف خالص نیتوں اور پاک و صاف دلوں کو دیکھتا ہے: لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُھَا وَلَا دِمَآءُھَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ۔ (خدا تک قربانی کے جانوروں کا گوشت نہیں پہنچتا بلکہ اُس تک صرف تمھاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔) یہ چھلکے اُتر گئے تو خالص مغز ہی باقی رہ گیا، اب وادیٔ مکہ میں خلوص کے دو قدیم و جدید منظر نمایاں ہوگئے، ایک طرف آب زمزم کی شفاف سطح لہریں لے رہی تھی، دوسری طرف ایک جدید النشاۃ قوم کا دریائے وحدت موجیں مار رہا تھا۔

اعلان عام و حجۃ الوداع: لیکن دنیا اب تک اس اجتماع عظیم کی حقیقت سے بے خبر تھی، اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی کا مدوجزر تمام عرب دیکھ چکا تھا، مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسلام کی تاریخی زندگی کن نتائج پر مشتمل تھی اور مسلمانوں کی جدوجہد، فدویت، ایثار نفس و روح کا مقصد اعظم کیا تھا، اب اُس کی توضیح کا وقت آ گیا تھا: حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کا سنگ بنیاد اس دُعا کو پڑھ کر رکھا تھا: وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰھِیۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَھۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡھُمۡ بِاللّٰہِ وَا

لۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ۔ (جب ابراہیمؑ نے کہا کہ خداوندا اس شہر کو امن کا شہر بنا، اور اس کے باشندے اگر خدا، اور روز قیامت پر ایمان لائیں تو اُن کو ہر قسم کے ثمرات و انعام عطا فرما۔)

جس وقت اُنہوں نے یہ دُعا کی تھی، تمام دنیا فتنہ و فساد کا گہوارہ بن رہی تھی، دنیا کا امن و امان اُٹھ گیا تھا، اور اطمینان و سکون کی نیند آنکھوں سے اُڑ گئی تھی، دُنیا کی عزت و آبرو معرض خطر میں تھی جان و مال کا تحفظ ناممکن ہوگیا تھا، کمزور اور ضعیف لوگوں کے حقوق پامال کردیے گئے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے آباد دُنیا کے ناپاک حصوں سے کنارہ کش ہو کر ایک وادیٔ غیر ذی ذرع میں سکونت اختیار کی، وہاں ایک دارالامن بنایا۔ اور تمام دُنیا کو صلح و اسلام کی دعوت عام دی، اب اُن کی صالح اولاد سے یہ دارالامن بھی چھین لیا گیا تھا، اس لیے اُس کی واپسی کے لیے پورے دس سال تک اُس کے فرزند نے بھی باپ کی طرح میدان میں ڈیرہ ڈالا، فتح مکہ نے جب اُس کا مامن و ملجا واپس دلا دیا تو وہ اس میں داخل ہوا کہ باپ کی طرح تمام دُنیا کو گمشدہ حق کی واپسی کی بشارت دے، چناں چہ وہ اونٹ پر سوار ہو کر نکلا اور تمام دنیا کو مژدۂ امن و عدالت سُنایا۔

خُطبہ حجۃ الوداع: ان دماؤ کم واموالکم حرام لحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا الا ان کل شیءٍ من امرالجاهلیة تحت قدمی موضوع وَ اول دم اضعهُ دماء تا دم ابن ربیعة و رباالجاهلیة موضوع و اول رباضع ربانا ربا عباس ابن عبدالمطلب اللّٰهم اشهداللّٰهم اشهد اللّٰهم اشهد ۔ (جس طرح تم آج کے دن کی، اس مہینہ کی، اس شہر مقدس میں حُرمت کرتے ہو اسی طرح تمھارا خون اور تمھارا مال بھی تم پر حرام ہے، اچھی طرح سُن لو کہ جاہلیت کی تمام بُری رسموں کو آج میں اپنے دونوں قدموں سے کچل ڈالتا ہوں، بالخصوص زمانہ جاہلیت کے انتقام اور خون بہا لینے کی رسم تو بالکل مٹا دی جاتی ہے، میں سب سے پہلے بھائی ابن ربیعہ کے خون کے انتقام سے دست بردار ہوتا ہوں جاہلیت کی سود خواری کا طریقہ بھی مٹا دیا جاتا ہے

اورسب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس ابن عبدالمطلب کے سود کو چھوڑتا ہوں، خدایا تو گواہ رہنا، خدایا تو گواہ رہنا، خدایا تو گواہ رہنا، کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا۔)

تکمیل دین الٰہی: اب حق پھر اپنے اصلی مرکز پر آگیا اور باپؑ نے دُنیا کی ہدایت وارشاد کے لئے جس نقطہ سے پہلا قدم اُٹھایا تھا بیٹےؐ کے روحانی سفر کی وہ آخری منزل ہوئی اور اُسی نقطہ پر پہنچ کر اسلام کی تکمیل ہوگئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط۔ (آج کے دن میں نے تمھارے دین کو بالکل مکمل کر دیا اور تم پر اپنے تمام احسانات پورے کر دیے اور میں نے تمھارے اسلام کو برگزیدہ دین منتخب کیا ہے۔)

آستانہ دہلی جولائی ۱۹۵۴

☆☆☆

اِسلامی دستورالعمل میں فوجی روح پوشیدہ ہے

اسلام کی تلوار ہمیشہ مظلوموں کی حمایت کے لیے چمکی ہے

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی جو عادلانہ تقسیم خدا نے کر دی ہے۔ اُس کو عدل وحقیقت کے ساتھ قائم رکھنا ایک مکمل مذہب کا اصلی فرض ہے انسان نے ابتداء ہی سے ان حقوق میں دست اندازی کی ہے اور جس قدر اُس نے حقوق اللہ کو پامال کیا، اُسی قدر حقوق العباد بھی پامال ہوتے گئے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے زمانہ میں حقوق اللہ کی بربادی اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ گئی تھی۔

خدا تعالیٰ نے اپنے حقوق کی محافظت کے لیے کبھی زمین پر انسان کا خون نہیں بہایا ۔صرف انسان کے ظلم ہی نے زمین کو خون سے رنگین کیا ہے۔اور یہ دھبہ اُس کے دامن پر اُس وقت سے لگا ہے جب ایک بھائی قابیل نے دوسرے بھائی ہابیل پر تلوار اُٹھائی تھی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک حقوق اللہ بالکل مٹ گئے تھے اور شیطان انسان کے اندر سے صاف صاف بول رہا تھا۔

فرعون نے اپنے ارکان سلطنت سے کہا میں اپنے سوا نہیں جانتا کہ تمہارا اور بھی کوئی خدا ہے۔وہ اگر صرف اسی دعوے پر قانع رہتا تو ممکن تھا کہ خدا کا غصہ اُس سے چشم پوشی کرتا اور اُس کے سر پر خدا کی تلوار نہ چمکتی لیکن اُس نے اس حد سے بھی ترقی کی اور حقوق العباد کے حدود میں ظلم وجبر کا قدم رکھا۔اس نقطہ پر پہنچ کر ہمیشہ خدا کی تلوار میان سے نکل آتی ہے اور دنیا کو خون کے دریا میں تیرنا پڑتا ہے۔چناں چہ خدا نے اپنے حقوق سے تو چشم پوشی کر لی لیکن وہ اپنے بندوں کی پامالی کو نہیں دیکھ سکا۔اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی حفاظت کے لیے فرعون کے پاس بھیجا اور حکم دیا

''اے موسٰی فرعون کی طرف جا کیوں کہ وہ نہایت ظالم اور سرکش ہو گیا ہے۔''

یہ پہلا دن تھا کہ خدا کے ایک صالح بندے نے قیام امن اور حیاتِ حق کے لیے ہاتھ میں تلوار لی اور اُسی دن سے تربیت عسکری کی مذہبی روح نے دنیا میں ظہور کیا۔

اسلام دین الٰہی کی آخری تکمیل تھی۔ پس وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی حفاظت کا تنہا ذمہ دار تھا۔ ایک طرف تو وہ اُن بتوں کو چور چور کر دینا چاہتا تھا جنھوں نے خدا کے جبروت و قدوسیت کا اپنے آپ کو شریک بنالیا تھا۔ دوسری طرف وہ اُن تمام بیڑیوں سے انسانیت کو نجات بخشنا چاہتا تھا جو طرح طرح کی سیاسی، مذہبی، اخلاقی معاشرتی اور ذہنی غلامیوں کی شکل میں اُس کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں اور جن کی وجہ سے تمام کرۂ ارض اللہ کے بندوں کے لیے ایک جہنم کدہ بنا ہوا تھا۔

اسلام نے کامل دس سال تک ہر قسم کی جسمانی تکلیفیں برداشت کیں ہر قسم کی دنیوی ذلتیں سہیں۔ ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ کیا لیکن کفار کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کی اور اُن کو نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ توحید کی دعوت دیتا رہا۔ اس طرح جب اُس نے مسلمانوں کو اسوۂ ابراہیمؑ کا خوگر بنالیا اور اُس کے ساتھ فوجی تعلیم کی سب سے بڑی عملی مشق یعنی صبر و تحمل اور عزم و استقلال کی تکمیل ہو گئی تو پھر حقوق العباد کی محافظت کے لیے اسوۂ موسوی کا اتباع کرتے ہوئے متبعین اسلام کو عسکری تعلیم دی۔ یہیں سے عملاً اسلام کی فوجی زندگی شروع ہوتی ہے حق و صداقت کا جو وعظ وہ آج تک صرف زبان سے سُناتا تھا اب اس میں زبان تیغ کو بھی شامل کر لیا گیا۔

اسلام کے تمام اعمال و عبادات پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تغیر محض کوئی فوری تغیر نہ تھا جو انصار مدینہ کی اعانت یا کفار مکہ کہ ظلم سے وقوع میں آیا ہو بلکہ یہ تغیر اس لیے ہوا کیوں کہ اسلام کا حقیقی دستور العمل صرف جہاد تھا۔ اور وہ اب مسلمانوں کے نظام عمل کی رگ رگ میں سرایت

کر گیا تھا۔ فرائضِ اسلام کی ابتداء نماز سے ہوتی ہے اور وہ تمام تر فوجی قالب میں ڈھالی گئی ہے نماز کے تمام ارکان مجاہدین حق کے اعمال ہی کی تصویر ہیں۔

فوج کو میدانِ کارزار میں بھوک اور پیاس کی جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ روزہ کے ذریعہ مسلمانوں کو اُن کا خوگر بنایا گیا ہے اقسام جہاد کی وسعت نے۔ ''جہاد بالمال'' کی ایک خاص قسم پیدا کر دی تھی۔ یعنی کلمہ حق کے لیے جان کے ساتھ مال کو بھی لٹانا ضروری ہو گیا تھا۔ زکوٰۃ و صدقہ کے ذریعہ اسلام نے اس کا باضابطہ نظام قائم کر دیا۔ حج اسلام کے تمام اعمال کا مجموعہ ہے جس میں فوجی تربیت کی روح پوشیدہ ہے۔ فوجی زندگی کے لیے شدائد سفر ہیں۔ عزیزوں اور قریبوں سے جُدائی ہے۔ صرف ایک ہی وردی پر قناعت کرنی ہے اور ایک ہی میدان میں سب کو جمع ہو کر اپنے مقصود وحید کو ڈھونڈھنا ہے حج کے اندر فوجی زندگی کی یہ تمام تعلیمیں موجود ہیں۔

گویا جو مسلمان کامل طور پر فرائضِ و عبادات کا پابند ہے وہی مسلم ہے اور جو مسلم ہے وہ لازمی طور پر مجاہد فی سبیل اللہ اور فوج حق کا نمائندہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسی قلیل جماعت جس کو روزِ اول ہی سے فوجی تعلیم دی گئی ہو۔ جس کا مجموعہ عبادات فوجی تربیت کا بہترین مظہر ہو۔ جس نے کامل دس سال تک صبر و استقلال عزم و ثبات اور جفاکشی کی پوری مشق حاصل کر لی ہو اس نے اگر بدر و حنین میں کفار کی صفیں اُلٹ دیں خیبر کے قلعوں کو چُور چُور کر دیا۔ اور قیصر و کسریٰ کو جا کر پامال کر آئی تو کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔

دنیا نے ہمیشہ فوج کے حقیقت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا فوجی کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اُس عالمگیر غلطی کا پردہ چاک کر دیا جو دماغوں پر مسلط ہو چکی تھی۔ ایک مدت تک دنیا نے فوج کا مفہوم صرف اسی قدر سمجھا تھا کہ فوج بہت بڑی تعداد کے مجموعہ کا نام ہے اور اُس کی طاقت صرف تعداد اور آلات ہی پر موقوف ہے اس کے بعد اس نظام میں کسی قدر ترقی ہوئی

اور جسمانی صحت وتندرستی اور عصبی طاقت کا بھی اضافہ کیا گیا۔ چناں چہ فوجی قابلیت پیدا کرنے کے لیے اسپارٹا میں ایک قانون نافذ کیا گیا جس کا منشا یہ تھا کہ جو بچے فطرتاً ضعیف اور کمزور پیدا ہوں اُن کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ اسپارٹا میں اس قانون پر عمل کیا گیا اور چند ہی دنوں میں اُس کی سرزمین نے اپنی آغوش کو قوی ہیکل نوجوانوں سے بھر دیا۔ اور اس طرح یہ ملک فوجی اعتبار سے مضبوط ترین ملک شمار ہونے لگا۔

درحقیقت فوجی نظام کی یہ ترکیب ایک فلسفیانہ غلطی پر مبنی تھی یہ نظام اس خیال پر مبنی تھا کہ فوج صرف اپنی جسمانی طاقت ہی سے لڑتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوج میدانِ جنگ میں کسی خارجی طاقت سے نہیں لڑتی بلکہ وہ حریف کا مقابلہ صرف جذبات کی اندرونی قوت سے کرتی ہے۔ اور جذبات کی یہ قوت غیر محدود تعداد اور غیر معمولی طاقت کے سپاہیوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جذبات کی قوت چند کمزور انسانوں اور مسکینوں کے اندر بھی پیدا ہو سکتی ہے اور پیدا ہو کر وہی نتائج حاصل کر سکتی ہے جو ایک ٹڈی دل اور قوی فوج کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

اسلام پہلا فوجی مذہب ہے جس نے فوجی تربیت کی بنیاد اسی اُصول پر قرار دی اور اسی اُصول پر اُس نے مجاہدین اسلام کی فوجی تعلیم شروع کی۔ اُس نے بتایا کہ فتح وظفر بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا گروہ بھی اپنے اندر ایمان باللہ پیدا کر کے ایک عظیم الشان جماعت کو شکست دے سکتا ہے۔

کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے بڑے گروہوں پر خدا کے حکم سے غالب آ گئے اور خدا صرف اربابِ عزم وہمت ہی کے ساتھ ہے۔

غرض کہ اسپارٹا کی سرزمین جن ضعیف بچوں کو اپنے آغوش سے نہایت بے دردی کے ساتھ پھینک دیتی تھی اسلام نے انھیں آغوش محبت میں اٹھا لیا۔ اور اُن کو بہترین سپاہی بنا دیا۔

کیوں کہ فوج صرف جذبات کی رُوح سے طاقتور ہو کر لڑتی ہے اور جذبات کا اثر ضعیف الاعصاب لوگوں پر قوت والوں سے کہیں زیادہ پڑتا ہے اس لیے وہی بہترین فوجی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ پھر ان کو ضعف وناتوانائی کے جُرم کی بنا پر کیوں ٹھکرایا جائے۔ چناں چہ کتب احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فوجی دربار صرف بڑے بڑے جسموں اور چوڑے چکلے سینوں ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ اس میں ہمیشہ ضعیفوں اور ناتوانوں کو خاص رحمت ومحبت کے ساتھ ڈھونڈا جاتا تھا۔ غرض کہ اسلام نے فوجی نظام کی ترتیب میں مادہ کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اُس کی ترکیب صرف رُوح سے کی اور اس رُوح نے دنیا میں ایک زبردست سیاسی اور فوجی انقلاب برپا کر دیا۔

اور چوں کہ یہ رُوح پاکیزہ جذبات اور بلند نظریات پر مبنی تھی اس لیے اسلامی فوج نے دنیا کی دوسری فوجوں کی طرح ظلم وستم برپا نہیں کیا۔ بے گناہوں اور کمزوروں پر اسلام کی تلوار نہیں اُٹھی بلکہ اسلام کی تلوار ہمیشہ کمزوروں کی حمایت میں چمکی اور اس کا منشا صرف یہ رہا کہ دنیا کے کونے کونے میں کلمۂ حق بلند ہو اسلام ایک مکمل مذہب کے تمام اجزاء کا مجموعہ ہے اس لیے اُس نے عقائد و عبادات کے سلسلہ میں اخلاق کو بھی نمایاں جگہ دی ہے۔ نیز صبر وتوکل اور عزم واستقلال کی ہر موقع پر تعلیم دی ہے اور یہی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے کوئی فوج میدان جنگ میں ثابت قدم رہ سکتی ہے۔ چناں چہ اسلامی فوج ثابت قدم رہی اور دنیا کے بیشتر حصہ پر چھا گئی۔

دین دنیا دہلی اگست ۱۹۵۵ء

☆☆☆

سیرت سرورِ کونین صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

مولود کی مجالس کا عجیب حال ہے، مقصد مجلس کے لحاظ سے دیکھیے تو فقیر کے اعتقاد میں اس سے زیادہ اہم، عظیم المنفعت اور قوم کے لیے ذریعہ ارشاد وہدایت اور کوئی اجتماع نہیں، لیکن طریق انعقاد پر نظر ڈالیے تو اجتماعی ومجلسی قوتوں کے ضائع کرنے کی بھی اس سے زیادہ اور کوئی افسوس ناک مثال نہیں ملے گی، اسلام ایک تعلیم ہے اور اس تعلیم کا عملی نمونہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ مَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرُ اللّٰہَ کَثِیْرًا۔ (بے شک رسول اللہؐ کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے پیروی اور اتباع کا ایک بہترین نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں اور خدا کا بکثرت ذکر کرنے والے ہیں۔)

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے پوچھا گیا کہ اس صاحبؑ خلقِ عظیم کا اخلاق کیا تھا تو انھوں نے فرمایا ''کَانَ خَلقُہُ القرآن ''۔ (اگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اخلاق دیکھنا ہے تو قرآن کو دیکھ لو کہ اس ''کتاب مرقوم'' کا وہ ایک ظلِّ مجسم اور اس کے عملی نمونہ کی ایک ''لوحِ محفوظ'' ہے۔)

پس مولود کی مجلسوں کا اصلی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اس ''اسوۂ حسنہ'' کے جمالِ الٰہی کی تجلی گاہ ہوتیں..... آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح حالات زندگی سنائے جاتے، آپؐ کے اخلاق عظیمہ اور فضائل کریمہ کے اتباع کی لوگوں کو دعوت دی جاتی اور ان اعمال کا دلوں میں شوق وولولہ پیدا کیا جاتا، جو ایک ''مسلم ومومن'' زندگی کے کیرکٹر کا اصلی مایۂ خمیر ہیں اور جن کے اتباع نے صحابہؓ کرام

کی زندگی کو اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ لسان الٰہی نے یُحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗ کی صدائے محبت سے اُنؓ کی مدح سرائی کی اور اتباع محبوبؐ نے اُن کو خود محبوب بنا دیا۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (اے پیغمبرؐ! مدعیانِ محبت الٰہی سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو (اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعوے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ خود اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور وہ نہایت مہربان بخشنے والا ہے۔)

اگر ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ ان مجالس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے سعادت کونین کا ذریعہ اور کیا تھا؟ یہ تمام کانفرنسیں اور انجمنیں جن کا چاروں طرف ہنگامہ بپا ہے، ایک طرف اور اس مجلس کا ایک لمحہ ایک طرف جو اس ''اسوۂ حسنہ'' کے نظارہ میں بسر ہو، ہماری مجلسیں اسی ذکر کے لیے ہونی چاہئیں اور ہماری آنکھیں اسی جمال جہاں آرا کے نظارے کے لیے وقف رہنی چاہئیں۔

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشان کا

ولنعم ما قیل:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذرانند وخم طرۂ یارے گیرند

بدبختی یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی ہیں، مگر حقیقت غارت ہوگئی ہے قومی تنزل کے معنی یہی ہیں کہ تمام قومی ودینی اشغال بظاہر قائم رہتے ہیں، لیکن ان کی روح مفقود ہو جاتی ہے، یہ نہیں ہے کہ ہماری مسجدیں اُجڑ گئی ہوں کتنے جھاڑ اور فانوس ہیں، جن سے مسجدیں بُقعۂ نور بنائی جاتی ہیں؟ مگر رونا یہ ہے کہ دل اُجڑ گئے ہیں اور یہ وہ بستی ہے کہ جب یہ ویران ہو جائے تو پھر آبادی کہاں؟

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔

مولود کی مجلسیں بھی اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک بہترین دینی عمل تھا، جس کی صورت تو قائم ہے مگر حقیقت مفقود، اب یہ محض ایک رسمی تقریب ہے، جو مثل اور رسمی صحبتوں کے ضروری سمجھ لی گئی ہے اور اُمراؤ رؤسا نے تو اپنی نمائش اور نمودِ دولت کا اس کو بھی ایک ذریعہ بنالیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح حالاتِ زندگی اور انقلاباتِ عظیمہ کے بیان کی جگہ (جو آپؐ کی ولادت کے واقعہ نے مشرق ومغرب میں پیدا کردیے) کتنے افسوس کی بات ہے کہ محض چند روایاتِ ضعیفہ وقصصِ موضوعہ کے بیان کرنے پر اتنے بڑے ملّی ودینی جذبہ کو قربان کردیا جاتا ہے؟ اور پھر اگر محض طبقۂ عوام کا یہ حال ہوتو قابل شکایت نہیں، لیکن تعجب اور صد ہزار تعجب ہے اس بوالعجبی پر کہ صدہا علماءِ ملت ہیں جو باوجود ادعاءِ رسوخ حدیث وسیر، وسعتِ نظر وعلم ان روایات کو خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں، خود پڑھتے ہیں اور لوگوں سے پڑھواتے ہیں، مگر ایک لحہ کے لیے بھی ان کے دل میں تحقیق وتفتیش کی جُنبش پیدا نہیں ہوئی۔ ان ھذا من اعاجیب الزمن! کاش! جس قدر بحث نفسِ انعقاد اور مجلس کے سنت وبدعت ہونے کی نسبت کی گئی ہے، وہ اس مجلس کی اصلاح حال کے لیے کی جاتی؟

وہ تمام چیزیں جو قوم میں شوق وشغف کے ساتھ موجود ہوں، درحقیقت ایک قوت ہیں پس سب سے اول کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اسٹیم کو ضائع کرنے کی جگہ اس سے مفید کام لیا جائے، البتہ اگر اصل کا رہی جادۂ شریعت سے منحرف ہو اور صورت اصلاح مفقود، تو پھر اس کے استیصال کی کوشش امر بالمعروف میں داخل اور ناگزیر ہے۔

(''الہلال'' جلد ۲، ۱۹۱۳ء)

میرے اعتقاد میں قرآن کریم جو ایک کتاب مُسْتُوْرٌ فِيْ رِقٍّ مَّنْشُوْرٍ ہے، اس کی لوحِ محفوظ حامل قرآن کی زندگی تھی اور میں لَقَدْ جَآئَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ" میں ''نور'' کو ''کتاب'' کا وصف نہیں سمجھتا، بلکہ ''نور'' میں انسان کامل کی زندگی کو سمجھتا ہوں، جس کی نسبت دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

اگر ہمیں مسلمان بننے کے لیے قرآن کریم کی تلاوت ضروری ہے، تو یقین کیجیے کہ اس کو ایک عملی زندگی کی صورت میں دیکھنے کے لیے اس ''اسوۂ حسنہ'' کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور یہ پچھلی ضرورت، پہلی سے کم اہم نہیں ہے اور اس کا بہترین ذریعہ مجالس ذکر مولد نبوی ہیں۔ بشرطیکہ ان میں عام رسائل مولود کی جگہ جو بالعموم موضوعات وقصص اور غیر مفید ولا حاصل عبارت وانشا کا مجموعہ ہیں، صحیح ومحقق حالات نبوی بیان کیے جائیں۔

اس قسم کی چیزیں دراصل عام لوگوں کے لکھنے اور پڑھنے کی نہیں ہیں، اس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو سیرت نبویؐ کے خطیب ہوں، جنھوں نے اس موضوع خاص کا مطالعہ کیا ہو، جن کو اس میں صاحب فن کا درجہ حاصل ہو اور وہ ہر مجلس اور مخصوص داعیات واحتیاجات کے مطابق سیرت نبویؐ پر خطبہ دے سکیں، ہر شہر، ہر محلّہ، ہر خاندان، ہر جماعت اور ہر مجلس کی ضروریات یکساں نہیں ہیں، کسی جماعت کے لیے سیرت نبویؐ کا کوئی خاص حصہ زیادہ تفصیل چاہتا ہے، کسی کے مخصوص وقتی حالات کسی خاص موقع کے اطناب کے طالب ہیں، کسی کو بدر کی فتح کا واقعہ سُنانا چاہیے اور کسی کو اُحد کی ہزیمت کے مصالح کے ذریعہ عزم واستقامت کی وصیت کرنی چاہیے کسی کے لیے مجاہدات وغزوات کے عزائم ضروری ہیں اور کسی کے لیے فتح مکہ کا عفو وصفح اور درگذر وکرم!

پھر ایک جماعت کے واقعات وحالات کے لحاظ سے اخلاق وخصائلِ نبوت میں سے کسی خاص خلق عظیم پر زور دینے کی ضرورت ہے اور دوسری کے لیے کسی دوسری حالت کی اگرچہ اس حیاتِ

طیّبہ مقدسہ کا کوئی فعل ایسا نہ تھا جو محبوب و محمود نہ ہو۔

زفرق تاقدمش ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں اینجاست

آپ ﷺ کی مبارک زندگی انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حصہ کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور زندگی اور زندگی کے متعلقات کی صدہا صورتیں ہیں، کون ہے جو اس صحیفہء نبوت کا اول سے آخر تک حق مطالعہ ادا کر سکتا ہے؟ پس بجز اس کے چارہ نہیں کہ اپنے چہرۂ اعمال کے حُسن و آرائش کا جو حصہ سب سے زیادہ بگڑ گیا ہو، سب سے پہلے اسی کو اس آئینہ میں دیکھ کر سنوار لیں۔

مشکل یہ ہے کہ ایسے لوگ کہاں سے آئیں اور اپنی ناواقفیتوں اور بے مائیگیوں کا ہم کہاں تک ماتم کریں؟ اگر بہت کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ہو کہ سیرت نبوی ﷺ پر مختلف مقاصد اور مختلف پیرایہ و ترتیب سے چھوٹے چھوٹے رسائل لکھے جائیں اور ان ہی کو لوگ مجالس میں پڑھ دیا کریں۔

ان رسائل میں مباحث و مناظرات متعلقۂ سیرت سے بالکلیہ چشم پوشی کی جائے، صرف حالات زندگی، صحت و تحقیق کے بعد درج کیے جائیں۔ اختصار ہر جگہ ملحوظ رہے اور صرف وہی مواقع مفصل ہوں، جن کی تفصیل ہماری موجودہ عملی زندگی کے لیے اسوۂ حسنہ کی دعوت رکھتے ہیں، اور جن کی نسبت ایک الہامی فکر کے ساتھ کہا گیا تھا، كَانَ خُلُقُهُ القرآن۔

ان رسائل سے عام مطالعہ و واقفیت اور اثر و اصلاح کے علاوہ مخصوص طور پر مقصود یہ ہے کہ مجالس ذکر ولادت نبوی کی اصلاح ہو اور یہ جو ایک نہایت قوی رسم اجتماع و احتفال کی موجود ہے اس قوت سے اصلی و حقیقی فائدہ اُٹھایا جائے۔

ایک مجموعہ خطبات سیرت کا ہو، جو صرف تعلیم یافتہ مجامع کے لیے مخصوص ہو، ایک مجموعہ صرف عام مجالس کے لیے ہو اور ایک مجموعہ بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے بطور درس و مطالعہ ہو،

سب سے پہلے کم از کم ان تین قسموں کی سیرتیں، علاوہ سیرت کبیر کے ضروری ہی لکھنی چاہئیں۔

نہایت مشکل اور اہم مسئلہ ان کتابوں کی زبان اور طرزِ تحریر کا ہے، علی الخصوص ایک ایسے عہد خیرہ مذاقی میں، جب کہ لوگ فن بیان و انشاء پردازی کا شوق تو پیدا کر لیتے ہیں، لیکن اس کے مواقع استعمال اور صحیح مفہوم بلاغت سے بے خبر ہیں۔

جو مجموعۂ خطبات مجالس و محافل ارباب علم و فکر کے لیے ہو اس کا انداز تحریر اور ہونا چاہیے اور مجالس عامہ کے لیے اور ایک میں تاریخ و سیرت کے اسلوب کے ساتھ اگر طرز بیان میں انشا پردازانہ علو و رفعت بھی پیدا کی جائے تو مضائقہ نہیں، کیوں کہ موضوع کی بلندی خود مستحق رفعت ہے۔ لیکن دوسرے میں تاریخ کی جگہ اصلاح و دعوت کا مقصد پوشیدہ ہو، مخاطب عامتہ الناس ہیں، اس لیے نہ تو اسلوبِ بیان مورخانہ و فلسفیانہ ہو اور نہ بلند و عالمانہ، نہایت عام فہم و سلیس اور محض سادہ و سہل، بایں ہمہ سادگی بیان ضروری ہے کہ سننے والے اس کے ہر لفظ پر بے اختیار دل و جان سپرد کر دیں، و انّ من البیان لسحرًا۔

جس بات کو میں نے یہاں چند سطروں میں لکھا ہے، غور کیجیے تو یہ ایک نہایت نازک اور دقیق نکتۂ بلاغت ہے اور افسوس کہ مصنفین عصر کو اس کا احساس نہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ایک عرصہ سے عام لوگ ذکر میلاد کی مجالس میں ٹھمری کے عادی ہو گئے ہیں، مجھ کو بہت سی ایسی صحبتیں یاد ہیں، جہاں غزلوں کے مطالب اور صراحت خطاب و ضمیر سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو یہ بتلانا محال ہوگا کہ مقدس ذکر دینی کی صحبت میں بیٹھے ہیں، یا کوئی نو آموز مگر صحیح معنوں میں خوش گلو مغنیہ ہمارے سامنے ہے۔

میں یہ کہنے سے نہیں شرماتا کہ موسیقی کو نہایت محبوب رکھتا ہوں اور چوں کہ دل رکھتا ہوں، اس لیے اس شے سے قطع تعلق نہیں کر سکتا، جس کا تعلق دل کے ساتھ، جسم اور روح کا تعلق ہے لیکن یہ تو کوئی شخص بھی پسند نہیں کر سکتا کہ مجالس دعوت مقدسہ و مذاکرات دینیہ کو موسیقی سے آلودہ کیا جائے،

میرے خیال میں اس ذکر مقدس کے لیے یقیناً یہ ایک ناقابل تحمل گستاخی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نئے خطبات سیرت تو اس دلکش عنصر سے بالکل خالی ہوں گے، ان کے پڑھنے کا انداز بھی نوحہ خوانی کی طرح نہیں، بلکہ ایک وعظ کی طرح بالکل تحت اللفظ ہوگا، اصلاح کے کاموں میں لوگوں کی دلچسپی کے قیام اور توجہ کی بقا سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے گا، نہایت ضروری اور اساسی امر یہ ہے کہ ان کے اسلوب بیان وطرز تحریر میں کچھ ایسی باتیں بھی جمع کی جائیں جن کا اثر و کشش تمام عوام پسند اجزاء، میلاد کی پوری پوری تلافی کردے اور طریق وعظ ودعوت بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

ان خطبات کی ضرورت تو مجالس ذکر مولود کے خیال سے ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی مختلف انداز بیان وترتیب اور تلخیص مطالب ومسائل کے ساتھ سیرت نبویؐ کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے، جو طرح طرح کی اشکال دعوت واثر میں اس اسوۂ حسنہ والہیہ کو اہل اسلام وغیر اہل اسلام کے سامنے پیش کرے۔

ضرورت تھی کہ ایک خاص ادارہ سیرت نبویؐ کی غرض سے قائم کیا جاتا، جس کا کام مسلسل اور دائمی ہوتا اور جو اس بارے میں تحقیقات وانکشافات فن کی خوبیوں کے ساتھ سیرت کے چھوٹے بڑے مختلف اشکال ومقاصد کے ایڈیشن بھی شائع کرتا رہتا، مجھ کو کئی بار خیال ہوا کہ ایک دو رسائل سیرت نبویؐ پر متذکرہ صدر اصولوں کو پیش نظر رکھ کر لکھوں اور آج اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا بھی اس لیے ہے کہ ارباب قلم ونظر کو اس طرف توجہ ہو اور ایک ابتدائی مشورہ ان کے سامنے آجائے۔

آستانہ دہلی نومبر ۱۹۶۳ء

☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جشن ولادت

ورود ماہ ربیع الاول

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ ممبر نتواں گفت

ماہ ربیع الاول کا ورود تمھارے لیے جشن ومسرت کا ایک پیغام عام ہوتا ہے کیوں کہ تم کو یاد آجاتا ہے کہ اس مہینہ کے ابتدائی ہفتوں میں خدا کی رحمت عامہ کا دُنیا میں ظہور ہوا۔ اور اسلام کے داعیٔ برحق کی پیدائش سے دنیا کی دائمی غمگینیاں اور سرگشتگیاں ختم کی گئیں۔۔۔ اور تم خوشیوں اور مسرتوں کے ولولوں سے معمور ہو جاتے ہو، تمھارے اندر خدا کے رسولؐ کی محبت وشیفتگی ایک بیخودانہ جوش ومحویت پیدا کر دیتی ہے۔ تم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اُس کی یاد میں، اُس کے تذکرہ میں اور اُس کی محبت کے لذّت وسرور میں بسر کرنا چاہتے ہو، تم اُس کے ذکر وفکر کی مجلسیں منعقد کرتے ہو۔ اُن کی آرائش وزینت میں اپنی محنت ومشقت کی کمائی بے دریغ لٹاتے ہو خوشبودار اور تروتازہ پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو، کافوری شمعوں کے خوبصورت فانوس اور برقی روشنی کے بکثرت کنول روشن کرتے ہو، عطر وگلاب کی مہک اور اگر بتیوں کا بخور جب ایوان مجلس کو اچھی طرح معطر کر دیتا ہے تو اس وقت مدح وثنا کے زمزموں اور درود وسلام کے مقدس ترانوں کے اندر اپنے مطلوب ومحبوب کی یاد کو ڈھونڈتے ہو اور بسا اوقات تمھاری آنکھوں کے آنسو اور تمھارے پُر محبت دلوں کی آہیں اُس کے اسمِ مبارک سے والہانہ عشق کرتی ہیں اور اُس کے عشق سے حیاتِ روحانی حاصل کرتی ہیں۔

پس کیا مبارک ہیں وہ دل، جنھوں نے اپنے عشق اور شیفتگی کے لیے رب السموات

والارض کے محبوب کو چُنا، اور کیا پاک و مطہر ہیں وہ زبانیں جو سید المرسلین و رحمۃ للعلمین کی مدح وثنا میں زمزمہ سنج ہوئیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

تم نے اپنے عشق و شیفتگی کے لیے اُس کی محبوبیت کو چُنا۔ جس کو خود خدا نے اپنی چاہتوں اور محبتوں سے ممتاز کیا۔ اور اپنی زبانوں سے اُس کی مدح وثنا کی جس کی مدح وثنا میں خود خدائی زبان، اس کے ملائکہ اور قدسیوں کی زبان اور کائنات ارض کی تمام پاک روحوں اور سعید ہستیوں کی زبان تمھاری ہم نوا ہوئی۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

بلاشبہ محبت نبوی اور عشق محمدیؐ کے یہ پاک ولولے اور یہ مخلصانہ ذوق و شوق تمھاری زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ اور تم اپنے ان پاک جذبات کی جتنی بھی حفاظت کرو کم ہے۔ تمھارا یہ عشق الٰہی ہے تمھاری یہ محبت ربانی ہے۔ تمھاری یہ شیفتگی انسانی سعادت اور راست بازی کا سرچشمہ ہے کہ تم اس وجود مقدس و مطہر کی محبت رکھتے ہو جس کو تمام کائنات انسانی میں سے تمھارے خدا نے ہر طرح کی محبوبیتوں اور ہر طرح کی محمودیتوں کے لیے چُن لیا۔ اور محبوبیت عالم کا خلعت اعلیٰ صرف اس کے وجود اقدس پر راست آیا۔ کرۂ ارضی کی سطح پر انسان کے لیے بڑی سے بڑی بات جو لکھی جاسکتی ہے زیادہ سے زیادہ عشق جو کیا جاسکتا ہے اعلیٰ سے اعلیٰ مدح وثنا جو کی جاسکتی ہے غرض کہ انسان کی زبان انسان کے لیے جو کچھ کہہ سکتی ہے اور کرسکتی ہے وہ سب کا سب صرف اسی ایک انسان کامل و اکمل کے لیے ہے اور اُس کا مستحق اُس کے سوا کوئی اور ہے بھی نہیں۔

مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رود

وحدہٗ لاشریک خدا کی الوہیت اور ربوبیت جس طرح وحدہٗ لاشریک ہے کہ کوئی ہستی اُس کی شریک نہیں اسی طرح اس انسان کامل کی انسانیت و عبدیت میں کوئی اُس کا ساتھی نہیں اس کے حسن و جمال کی فردانیت میں کوئی شریک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں تم دیکھتے ہو کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا گیا ہے وہاں ان سب کو اُن کے ناموں سے پکارا ہے، اور اُن کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے تو اُن کے ناموں کے ساتھ کیا ہے، لیکن اس انسان کامل، اس فرد اکمل، اس صفات عبدیت کے وحدہٗ لاشریک کا اکثر مقامات میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ نہ تو اُس کا نام لیا گیا ہے، نہ ہی کسی دوسرے وصف سے نامزد کیا گیا ہے، بلکہ صرف ''عبد'' کے لفظ سے اُس کے پروردگار نے اُسے یاد فرمایا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى ہ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ

اسی طرح سورۂ جن، سورۂ فرقان، سورۂ نجم، اور سورۂ حدید میں آپؐ کا ذکر کیا گیا ہے۔

پس ان تمام مقامات میں آپؐ کا اسم گرامی نہیں لیا گیا ہے بلکہ اُس کی جگہ ''عبد'' فرمایا گیا ہے۔

حالانکہ بعض دیگر انبیاء کے لیے اگر ''عبد'' کا لفظ فرمایا ہے تو اُس کے ساتھ نام کی تصریح بھی درج کردی گئی ہے۔ سورۂ مریم میں حضرت ذکریاؑ کے لیے فرمایا:۔

ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا

سورۂ جن میں فرمایا وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ نیز وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوْبَ ہ

اس خصوصیت و امتیاز سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود الٰہی تھا کہ اس وجود گرامی کی

عبدیت اور بندگی اس درجہ آخری اور مرتبۂ بلند کو پہنچ چکی ہے جو انسانیت کی انتہا ہے اور جس میں اور کوئی عبد اس ''عبد کامل'' کا شریک مکرم نہیں ہے۔ پس جس کی قدوسیت و جبروتیت کا یہ مرتبہ ہو اس کی یاد میں جتنی گھڑیاں بھی کٹ جائیں، اُس کے عشق میں جتنے آنسو بھی بہہ جائیں، اُس کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور اُس کی مدح وثنا میں جتنی زبانیں بھی زمزمہ پیرا ہوں، انسانیت کا حاصل، روح کی سعادت، دل کی طہارت اور زندگی کی پاکی کی علامت ہے۔

راہِ تو بہر قدم کہ پویند خوش است　　وصلِ تو بہر کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　نام تو بہر زباں کہ گویند خوش است

لیکن جب تم اس ماہِ مبارک میں یہ سب کچھ کرتے ہو اور اس ماہ کے واقعہ ولادت کی یاد میں خوشیاں مناتے ہو تو اُس کی مسرتوں کے اندر تمھیں کبھی اپنا وہ ماتم بھی یاد آتا ہے جس کے بغیر اب تمھاری کوئی خوشی نہیں ہوسکتی، کبھی تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ یہ کس کی پیدائش ہے کہ جس کی یاد کے لیے تم سروسامان جشن کرتے ہو۔ یہ کون تھا جس کی ولادت کے تذکرہ میں تمھارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا ایسا عزیز پیام ہے؟

آہ! اس مہینہ کی آمد اگر تمھارے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے کیوں کہ اسی مہینہ میں وہ آیا، جس نے تم کو سب کچھ دیا تھا تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کسی مہینہ میں ماتم نہیں کیوں کہ اسی مہینہ میں پیدا ہونے والے نے جو کچھ تمھیں دیا تھا وہ سب کچھ تم نے کھو دیا۔ اس لیے اگر یہ ماہ ایک طرف بخشنے والے کی یاد تازہ کرتا ہے تو دوسری طرف کھونے والوں کے زخم کو بھی تازہ ہو جانا چاہیے۔

ما خانہ　رمیدگانِ　ظلمیم
پیغامِ　خوش　از　دیارِ ما نیست

تم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہو مگر تمھیں اپنے دل کی اُجڑی ہوئی بستی کی بھی

کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو۔ مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دور کرنے کے لیے کوئی چراغ روشن نہیں کرتے تم پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو، مگر آہ تمھارے اعمال حسنہ کا پھول مُرجھا گیا　ہے۔ تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رومال و آستیں کو معطر کرنا چاہتے ہو، مگر آہ! تمھاری غفلت، کہ تمھاری عظمت اسلامی کی عطر بیزی سے تمھاری روح یکسر محروم ہے۔ کاش تمھاری مجلسیں تاریک ہوتیں، تمھارے اینٹ اور چونے کے مکانوں کو زیب و زینتِ یک ذرّہ نصیب نہ ہوتی تمھاری آنکھیں رات رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں۔ تمھاری زبانوں سے ماہ ربیع الاول کی ولادت کے لیے دُنیا کچھ نہ سُنتی، مگر تمھاری روح کی آبادی معمور ہوتی، تمھاری دل کی بستی نہ اُجڑتی، تمھارا طالع بیدار ہوتا۔ تمھاری زبانوں سے نہیں، مگر تمھارے اعمال کے اندر سے اُسوۂ حسنہ نبیؐ کی مدح وثنا کے ترانے اُٹھتے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پھر آہ وہ قوم اور آہ! اُس قوم کی غفلت و نادانی! جس کے لیے ہر جشن مسرت میں پیام ماتم ہے، اور جس کی حیات قومی کا ہر قہقہۂ عیش فغان حسرت ہو گیا ہے، مگر نہ تو ماضی کی عظمتوں میں اُس کے لیے کوئی منظر عبرت ہے، نہ حال کے واقعات و حوادث میں کوئی پیام تنبیہ و ہوشیاری ہے۔ اور نہ مستقبل کی تاریکیوں میں زندگی کی کوئی روشنی اپنے سامنے رکھتی ہے۔

ظہور و مقصد ظہور　ماہ ربیع الاول کی یاد میں ہمارے لیے جشن و مسرت کا پیام اس لیے تھا کہ اسی مہینہ میں خدا کا وہ فرمان رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا۔ ظلم و طغیان اور فساد و عصیاں کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ خدا اور اُس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جُڑ گیا۔ انسانی اُخوت و مساوات کی یگانگت نے دُشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا۔ اور کلمۂ کفر و ضلالت

کی جگہ کلمۂ حق وعدالت کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔

لَقَدۡ جَاءَکُمۡ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیۡنٌ یَهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَ یَهۡدِیۡهِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ہ

لیکن دنیا شقاوت وحرمانی کے دور سے پھر دُکھیا ہوگئی، انسانی شر وفساد اور ظلم وطغیانی کی تاریکی خدا کی روشنی پر غالب آنے کے لیے پھیل گئی۔ سچائی اور راست بازی کی کھیتیوں نے پامالی پائی، اور انسانوں کے بے راہ گلہ کا کوئی رکھوالا نہ رہا۔ خدا کی وہ زمین جو صرف خدا ہی کے لیے تھی، غیروں کو دے دی گئی، اور اُس کے کلمۂ حق وعدل کے غمگساروں اور ساتھیوں سے اس کی سطح خالی ہوگئی۔

ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاس ہ

یہ ماہ ربیع الاول اگر تمھارے لیے خوشیوں کی بہار ہے تو صرف اس لیے کہ اس مہینہ میں دنیا کی خزاں اور ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا موسم ربیع شروع ہوا۔ پھر اگر آج دنیا کی عدالت، سموم ضلالت کے جھونکوں سے مُرجھا گئی ہو تو اے غفلت پرستو! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے؟

آتشیں شریعت اس موسم کی خوشیاں اس لیے تھیں کے اس میں اللہ کی عدالت کی وہ ''آتشیں شریعت'' کوہ فاراں پر نمودار ہوئی جس کی چوٹیوں پر صاحب توراۃ کو خبر دی گئی تھی اور جو مظلومی کے آنسو بہانے، ذلّت ونامُرادی سے ٹھکرائے جانے کے لیے دنیا میں نہیں آئی تھی بلکہ اس لیے آئی تھی کہ اعداء حق وعدالت ناکامی کے آنسو بہائیں۔ دشمنانِ الٰہی مسکینی کے لیے چھوڑ دیئے جائیں، ضلالت وشقاوت نامرادی وناکامی کی ذلت سے ٹھکرائی جائے اور سچائی وراستی کا عرشِ عظمت واجلال نصرت الٰہی کی کامرانیوں اور اقبال وفیروز مندی کی فتح مندیوں کے ساتھ تمام کائنات ارضی میں اپنی جبروتیت وقدوسیت کا اعلان کرے۔ پس وہ اللہ کے ہاتھ کی چمکائی ہوئی ایک

تلوار تھی جس کی ہیبت وقہاریت نے باطل پرستی کی تمام طاقتوں کو لرزا دیا اور کلمۂ حق کی بادشاہت اور دائمی فتح کی دنیا کو بشارت سنائی۔

هُوَ الَّذِیۡ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہ

کیوں کہ وہ جو ربیع الاول میں آیا اُس نے کہا کہ غم اور ناکامی اُن کے لیے ہونی چاہیے جن کے پاس کامیابی ونصرت بخشنے والے کا رشتہ نہیں ہے۔ جن پاک روحوں نے خدا کی سچائی اور کلمۂ حق وعدل کی خدمت گزاری کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے البتہ اُن کی ہیبت وقہاریت سے دنیا کو ڈرنا چاہیے۔ دنیا میں متضاد سے متضاد اجزا باہم جمع ہوسکتے ہیں آگ اور پانی ممکن ہے کہ ایک جگہ جمع ہوجائیں شیر اور بکری ہوسکتا ہے کہ ایک گھاٹ سے پانی پیئں۔ لیکن خدا کا ایمان اور انسان کا خوف یہ دونوں چیزیں ایسی متضاد ہیں جو کبھی بھی ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

استبدال نعمت لیکن آج جب تم عید میلاد کی مجلسیں منعقد کرتے ہو تو تمھارا کیا حال ہے وہ تمھاری دولت کہاں ہے جو تمھیں دی گئی تھی؟ وہ تمھاری روح حیات کیوں تمھیں چھوڑ کر چلی گئی جو تم میں پھونکی گئی تھی؟ آہ تمھارا خدا تم سے کیوں روٹھ گیا اور تمھارے آقا نے کیوں تم کو صرف اپنی ہی غلامی کے لیے نہ رکھا؟ کیا ربیع الاول کے آنے والے نے خدا کا یہ وعدہ نہیں پہنچایا تھا کہ عزت صرف تمھارے ہی لیے ہے۔

اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُوۡمِنِیۡنَ

خدا اب بھی غیروں کے لیے نہیں بلکہ صرف تمھارے ہی لیے ہے بشرطیکہ تم بھی غیروں کے لیے نہیں بلکہ خدا ہی کے لیے ہوجاؤ۔

یادگار حریت تم ربیع الاول میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعوی رکھتے ہو اور مجلس

منعقد کر کے اس کی مدح وثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو۔لیکن تمھیں کہیں بھی یہ یاد نہیں آتا کہ جس کی یاد کا تمھاری زبان وعدہ کرتی ہے اُس کی فراموشی کے لیے تمھارا ہر عمل گواہ ہے۔اور جس کی مدح وثنا میں تمھاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں اُس کی عزت کو تمھارا وجود بٹہ لگا رہا ہے۔وہ دنیا میں اس لیے آیا تھا تا کہ انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کی صراط مستقیم پر چلائے اور غلامی کی ان تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے انہوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں۔اُس نے کہا کہ اطاعت صرف ایک ہی کی ہے اور حکم وفرمان ایک ہی کے لیے سزاوار ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ

اُس نے سب سے پہلے انسان کو اُس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلائی اور کہا کہ مومن نہ بادشاہوں کی غلامی کے لیے ہے، نہ کاہنوں کی اطاعت کے لیے نہ کسی اور انسانی طاقت کے آگے جُھکنے کے لیے ہے۔بلکہ اُس کے لیے ایک ہی چوکھٹ اُس کے دل کے لیے ایک ہی عشق، اُس کے پاؤں کے لیے ایک ہی زنجیر اور اُس کی گردن کے لیے ایک ہی طوق اطاعت ہے۔وہ جُھکتا ہے تو اُسی کے آگے، روتا ہے تو اُس کے لیے، اعتماد کرتا ہو تو اُسی کی ذات پر، ڈرتا اور لرزتا ہے تو اُسی کی ہیبت سے، اُمید کرتا ہے تو اُسی کی رحمت پر۔

پس اگر ربیع الاول کا مہینہ دنیا کے لیے خوشی اور مسرت کا مہینہ تھا تو صرف اس لیے کہ اسی مہینہ میں دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان آیا، جس نے مسلمانوں کو اُن کی سب سے بڑی نعمت یعنی خدا کی بندگی اور انسانوں کی آقائی عطا فرمائی۔اور اُن کو اللہ کے خلیفہ ونائب کا لقب دے کر خدا کی ایک پاک ومحترم امانت ٹھہرایا۔پس ربیع الاول انسانی حریت کی پیدائش کا مہینہ ہے۔غلامی کی موت اور ہلاکت کی یادگار ہے۔خلافت الٰہی کی بخشش کا اولین یوم ہے۔وراثت ارضی کی تقسیم کا اولین اعلان ہے۔اسی ماہ میں کلمۂ حق وعدل زندہ ہوا۔اور اسی میں کلمۂ ظلم وفساد اور کفر وظلالت کی لعنت سے خدا

کی زمین کو نجات ملی۔

لیکن آہ! تم کہ اس ماہ حریت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو اور اس کے لیے ایسی تیاریاں کرتے ہو گویا وہ تمھارے ہی لیے ہو اور تمھاری ہی خوشیوں کے لیے آیا ہے۔خدارا مجھے بتاؤ کہ تم کو اس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکت کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور روح کا اپنے کو ساتھی بنائے؟ کیا ایک مردہ لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کرے گی۔ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی خوشی ہے۔لیکن ایک اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے؟

پھر تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی، اپنی خواہشوں کی غلامی ماسوا۔۔اللہ رشتوں اور طاقتوں کی غلامی، اور غیر الٰہی قوتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چُھپا لیا ہے۔تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو، جو نہ تو خود ہل سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور روح ہے۔البتہ چور چور ہو سکتا ہے اور ایک دوسرے پر پٹکا جا سکتا ہے۔تم غبارِ راہ کی ایک مُشت ہو جس کو ہوا اُڑا لے جائے تو اُڑ سکتی ہے۔ورنہ خود صرف اس لیے ہے کہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور جولانی قدم سے پامال کی جائے۔

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا

پھر اے غفلت کی ہستیو! اور اے بے خبری کی سرگشتۂ خواب روحو! تم کس مُنہ سے اُس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریت انسانی کی بخشش، حمایت روحی ومعنوی کے عطیہ اور کامرانی وفیروزمندی کی بشارت لے کر آیا تھا۔اللہ اللہ! غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی، ماسوا

اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں، انسانوں کی ملوکیت و مرعوبیت کے حلقے گردنوں میں ہیں، ایمان باللہ کے ثبات سے دل خالی ہے، اور اعمال حقہ و حسنہ کی روشنی سے روح محروم ہے، ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہوئے ہو کہ ربیع الاول میں آنے والے کی یاد کا جشن مناؤ۔ جس کا آنا خدا کی عبودیت کی فتح، غیر الٰہی عبودیت کی ہلاکت، حُرّیت صادقہ کا اعلان حق، عدالت حقہ کی ملوکیت کی بشارت، اور اُمت عادلہ و قائمہ کے تمکن و قیام کی بنیاد تھا۔

پس اے غفلت شعاران مِلّت ! تمھاری غفلت پر صد فغان وحسرت اور تمھاری سرشاریوں پر صد ہزار نالہ وُبکا، اگر تم اس ماہ مبارک کی اصلی عظمت و حقیقت سے بے خبر رہو، اور صرف زبانوں کے ترانوں، در و دیوار کی آرائشوں اور روشنی کی قندیلوں ہی میں اس کے مقصد یادگاری کو گُم کرو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ماہِ مبارک اُمت مسلمہ کی بنیاد کا پہلا دن ہے۔ خداوندی بادشاہت کے قیام کا اولین اعلان ہے۔ خلافت ارضی و وراثت الٰہی کی بخشش کا پہلا مہینہ ہے۔۔۔۔۔ پس اس کے آنے کی خوشی اور اُس کے تذکرہ اور یاد کی لذت ہر اس شخص کی روح پر حرام ہے، جو اپنے ایمان وعمل کے اندر اس پیغام الٰہی کی تعمیل و اطاعت اور اُس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔

آستانہ دہلی جولائی 1966ء

☆☆☆

حُسنِ رسولؐ

موزوں کلام میں جو ثنائے نبیؐ ہوئی
تو ابتداء سے طبع رواں منتہی ہوئی

ہر بیت میں جو وصفِ پیمبرؐ رقم کیے
کاشانۂ سخن میں بڑی روشنی ہوئی

ظلمت رہی نہ پر تو حسن رسولؐ سے
بیکار اے فلک شبِ مہتاب بھی ہوئی

تاریک شب میں آپؐ نے رکھا جَہاں قدم
مہتابِ نقشِ پا سے وہاں روشنی ہوئی

ہے شاہِ دیں سے کوثر و تسنیم کا کلام
یہ آبرو تمام ہے. حضرتؐ کی دی ہوئی

آزادؔ اور فکر جگہ پائے گی کہاں
اُلفت ہے دِل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

☆☆☆

حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی قربانی

سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی ہر بات ''اسلام'' تھی حقیقتِ اسلامی میں ان کا وجود اس طرح فنا ہوگیا تھا کہ خود اُن کی کوئی ہستی باقی نہیں رہی تھی۔ جب کہ تاروں کی عجیب وغریب روشنی ان کے سامنے آئی، چاند کی دلفریبی نے ان کو آزمانا چاہا اور سورج اپنی سطوت وعظمت سے چمکا' تا کہ ان کی فطرت کو مرعوب کر سکے تو ''اسلام'' ہی تھا، جس نے اندر سے صدا دی کہ ''انی لَا اُحِبُّ الاٰفلین۔'' (میں فنا پذیر ہستیوں کو دوست نہیں رکھتا) اِنّی وَجَّھتُ وَجھِیَ لِلّذِیْ فَطَرَ السمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیفًاوّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشرِکِینَ ہ (میں ہر طرف سے کٹ کر صرف اس ایک ہی ذات کا ہوگیا ہوں جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا، الحمد للہ کہ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔) وَ کَذٰالِكَ نُرِی اِبُراھِیمَ مَلَکُوتَ السَّمٰوٰاتِ وَالاَرْضَ وَ لِیَکُونَ مِنَ الْمُوقِنِینَ ہ (اور اس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمان وزمین کے مناظر وعجائب دکھلائے تا کہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہوجائے۔)

انہوں نے جب آنکھ کھولی، تو اُن کے چاروں طرف بُت پرستی کے مناظر تھے۔ انہوں نے خود اپنے گھر کے اندر جس کسی کو دیکھا اس کے ہاتھ میں سنگ تراشی کے اوزار اور بُتوں کے ڈھانچے تھے، وہ کالڈیا کے بازاروں میں پھرے مگر جس طرف دیکھا بتوں کے آگے جُھکے ہوئے سر تھے اور جس طرف کان لگایا خدا فراموشی کی صدائیں آرہی تھیں، پھر وہ کون سی چیز تھی، جس نے ان تمام چیزوں سے ہٹا کر جو آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سُنی جاتی ہیں ان کے دل میں ایک اَن دیکھے محبوب کے عشق کی لگن لگادی اور ایک اَن سُنے نغمہ کی تلاش میں ان کے سامعہ کو مضطرب بنا دیا؟ اُن کے سامنے تو بتوں کی قطاریں تھیں، جن کو ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں، پھر وہ کون تھا، جو ان کے

اندر بیٹھا، خدائے قدوس کو دیکھ رہا تھا اور اس قدرتی جوش وقوت کے ساتھ، جو کسی بلندی سے گرنے والے آبشار، یا کسی زمین سے اُبلتے ہوئے چشمے میں ہوتا ہے اور اُن کی زبان سے فاطر السموات والارض کی یہ شہادت دے رہا تھا؟ اَلَّذِی خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْمِنُیِ وَ لَیَقِیْنِ وَ اِذَامَرِضْتُ فَھُوَ لَیَشْفِیْنَ، وَالَّذِی یَمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُھِیْنُ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ، (وہ جس نے مجھ کو پیدا کیا اور پھر ہدایت کی راہیں کھول دیں اور وہ کہ میں بھوکا ہوں تو وہ کھلاتا ہے اور جب میں پیاسا ہوتا ہوں تو وہ پلاتا ہے اور وہ، کہ جب اپنی بداعمالیوں سے میں بیمار پڑتا ہوں، تو اپنی رحمت سے وہ مجھے شفا دے دیتا ہے اور وہ جو موت دیتا ہے اور پھر موت کے بعد وہ حیات بخشے گا اور جس کی رحمت سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میری خطاؤں سے درگذر کرے گا۔) اور پھر یہ کیا تھا کہ جب کہ اُن کا سنگ تراش چچا پتھروں سے پرستش کے لیے صورتیں بناتا تھا تو بے اختیار اُن کی زبان سے نکلتا تھا کہ اِنَنی بَرَاءٌ مِمَّا تَعبُدُوْنَ۔ وَاِذَا قَالَ اِبْرَاھِیمُ لاَ بِیْہِ وَ قَوْمِہٖ اِنَّنِیْ بُرَاءٌ مِمَّا تَعبُدُوْنَ اِلَّاالَّذِیْ فَطَرَنِی فَاِ نَّہٗ سَیَھْدِیْنُ ہ (اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم جن بُت پرستیوں میں مبتلا ہو، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، البتہ مجھ کو اُس اَن دیکھی ذات سے سروکار ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور یقین ہے کہ وہی مجھ پر اپنی راہ کھول دے گا۔)

دراصل یہ وہی ''حقیقتِ اسلامیہ'' تھی جس نے اُن کے وجود کو آنے والی امتوں کے لیے ''اسوہ حسنہ'' بنادیا تھا اور جس کی وصیت انہوں نے اسحاق اور اسماعیل علیہما السلام کو کی اور پھر انہوں نے یعقوبؑ علیہما السلام کو اور اس کے بعد نسلاً بعد نسلاً سلسلہ ابراہیمی میں منتقل ہوتی رہی۔ وَوَصّٰی بِھَا اِبراھِیمُ بَنِیہِ وَ یَعْقُوب یَا بَنِّیِ اِنَّ اللّٰہ اصْطَفٰی لَکُمَاالدِّیْن فَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسلِمُوْنَ ہ (اور یہی اسلام تھا، جس کی وصیت ابراہیمؑ اپنی اولاد کو کر گئے اور پھر یعقوبؑ کو بھی، کہ اے فرزند! اللہ نے تم کو اس دین سے ممتاز فرمایا۔ پس تم زندگی بھر اس کی تعلیم دینا اور جب مرنا تو اسی

طریقہ پر مرنا۔) اور یہی حقیقت وہ ''روحِ اعظم'' تھی جو آدمؑ کے کالبد میں پھونکی گئی تھی۔

وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ (اور خدا نے آدم میں اپنی ''روح'' پھونکی)

اور یہی وہ روحِ الٰہی ہے، جو شریعتِ ابراہیمیؑ سے منسوب ہو کر سلسلۂ ابراہیمیؑ کی آخری اُمت، یعنی اُمتِ مرحومہ میں ظہور کرنے والی تھی اور جس کے یوم ظُہور کی ایک رات ایام الٰہیہ کے گذشتہ ہزار مہینوں پر افضلیت رکھتی ہے۔ اِنَّـا اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ، وَمَا اَدۡرٰکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ، لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ، خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَھۡرٍ ،تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ فِیۡھَا بِاِذۡنِ رَبِّھِمۡ مِّنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ۔ (ہم نے اسلام کو بصورتِ قرآن لیلۃُ القدر میں نازل کیا اور تم جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ وہ ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں پر افضلیت رکھتی ہے، اس رات ملائکہ اور ''روح'' کا نزول ہوتا ہے۔ جو اپنے پروردگار کے حکم سے (نظمِ روحانی) کے تمام امور کے لیے آتے ہیں وہ رات امن اور سلامتی کی رات ہے۔ طلوع صبح تک۔) اور یہی وہ حقیقت تھی جو اُن تمام حقیقتوں سے جو یہودیت یا مسیحیت سے تعبیر کی جا سکتی ہیں، اعلیٰ وارفع تھی، کیونکہ وہ تمام شاخیں اسی حقیقت الحقائق کی جڑ سے نکلی تھیں، پس ''اصل'' کی موجودگی میں ''فرع'' بے اثر ہے، اور ''کُل کے'' سامنے ''جُز'' بے حقیقت ہے، یہی سبب ہے کہ جب ''اصل وکل'' کی تکمیل کا آخری روز ہوا تو کہا گیا:۔وَ قَـالُـوۡا کُـوۡنُـوۡا ھُـوۡدًا اَوۡ نَـصٰـرٰی تَھۡتَـدُوۡا قُـلۡ بَـلۡ مِـلَّـۃَ اِبۡـرَاھِیۡـمَ حَنِیۡفًا وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ہ (یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تا کہ ہدایت پاؤ لیکن ان سے کہدو کہ نہیں، بلکہ صرف ملّتِ ابراہیمیؑ ہی میں تمام ہدایتوں کی حقیقت ہے اور وہ تمہاری طرح مشرکوں میں سے نہ تھا۔) اور یہی وہ انسان کی ''فطرتِ اصلی'' ہے جس کو..... قرآن کریم نے ''قلب سلیم'' کے لقب سے بھی یاد کیا ہے۔ یعنی قلبِ انسانی کی وہ بے میل حالت، جو خارجی اثراتِ ضلالت سے بالکل محفوظ ہو یا فطرتِ اصلی کا وہ ذوقِ صحیح، جس کا ذائقہ کسی عارضی بیماری کے اثر سے بگڑ نہ گیا ہو، کیوں کہ

انسان کے اندر جو کچھ ہے، وہ ''اسلام'' ہے اور کُفر جب آتا ہے تو باہر سے آتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت تصریح کر دی گئی ہے۔ اِذۡ جَـآءَ رَبَّـہٗ بِـقَـلۡـبٍ سَلِیۡمٍ (جب حضرت ابراہیمؑ اپنے رب کی طرف ''قلبِ سلیم'' کے ساتھ متوجہ ہوئے) اور پھر سُورہ شعرا کے چوتھے رکوع میں حضرت ابراہیمؑ نے آذر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دعا مانگی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے: یَـوۡمَ لَا یَـنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ ، اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ۔ (وہ آخری روز عدالت، جب کہ نہ تو مال و دولت کام دیں گے اور نہ اہل و عیال کام آئیں گے (یعنی کوئی مادی شئے مفید نہ ہوگی) مگر صرف وہ کامیاب ہوگا جس کے پہلو میں ''قلب سلیم'' ہے) یہی ''قلب سلیم'' تھا جس پر اجرامِ سماویہ کے مدہش مناظر فتح نہ پا سکے اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کے دل کے اندر فاطرِ ملکوت السموات والارض کے وجود پر شہادت دی۔

قَالَ بَـلۡ رَبُّـکُمۡ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الَّذِیۡ فَطَرَھُنَّ ، وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشّٰھِدِیۡنَ ۔ (ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو جواب میں کہا کہ وہ آسمان و زمین کا فاطر، جس نے ان کو پیدا کیا، تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں اُس کے وجود پر شہادت دیتا ہوں۔)

حقیقت اسلامی کی اصلی آزمائش: اور سب سے آخر یہ کہ جب حقیقت اسلامی کی آخری مگر اصلی آزمائش کا وقت آیا تو وہ ''اسلام'' ہی تھا، جس نے ابراہیمؑ کے ہاتھ میں چُھری دے دی۔ تا کہ فرزند کو ذبح کر کے محبت ماسویٰ اللہ کی قربانی کرے، یہ ''اسلام'' ہی تھا، جس نے اسماعیلؑ کی گردن جھکا دی، تا کہ اپنی جانِ عزیز کو اس کی راہ میں قربان کر دے جب کہ اُس نے پوچھا۔ یَـا بُنَیَّ اِنِّـیۡ اَرٰنِیۡ فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَا ذَا تَرٰی؟ (اے فرزند عزیز! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے اللہ کے نام پر ذبح کر رہا ہوں، پھر تیرے خیال میں یہ بات کیسی ہے؟) یہ وجود ابراہیمیؑ کی نہیں بلکہ ''اسلام'' ہی کی صدا تھی اور پھر جب اس کے جواب میں اسماعیلؑ نے کہا:

یَآ اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ، (اے باپؑ!...یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی اور اس کے حکم کا اشارہ ہے۔ پس جو اس کا حکم ہے اس کو بلا تامل انجام دیجیے۔ اگر اسی خدا کی مرضی ہوئی تو آپ دیکھ لیں گے کہ میں صبر کرنے والوں میں سے ہوں گا۔)

تو یہ بھی اسماعیلؑ کی نہیں بلکہ ''اسلام'' ہی کی صدا تھی، پھر جب باپؑ نے بیٹےؑ کو مینڈھے کی طرح سختی سے پکڑ کر زمین پر گرایا، تو وہ اسلام ہی کا ہاتھ تھا جو ابراہیمؑ کے اندر سے کام کر رہا تھا اور جب بیٹےؑ نے اس شوق و ذوق کے ساتھ، جو مدتوں کے پیاسے کو آبِ شیریں سے ہوتا ہے، اپنی گردن مضطرب ہو ہو کر چُھری سے قریب کر لی، تو وہ حقیقتِ اسلامی ہی کی محویت کا استیلا تھا جس نے نفسِ اسماعیلؑ کو فنا کر دیا تھا اور اسی فنا سے مقامِ ایمان کی بقا ملتی ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ۔

(پس سلام ہو حقیقتِ اسلامی کی قربانی کرنے والے ابراہیمؑ پر! ہم مقامِ احسان تک پہنچنے والوں کو (بقائے دوام) کا ایسا ہی بدلہ عطا فرماتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے حقیقی بندوں میں سے تھا)

غافل مرو کہ تا در بیت الحرام عشق!
صد منزل ست و منزلِ اول قیامت است

اللہ! اللہ! اس نیرنگ سازِ ازل کے کاروبارِ محبت کی بوقلمونی کیا کہیے کہ اس کے حریم محبت کی ساری آرائش دوستوں کے خون کے چھینٹوں اور مضطرب لاشوں کی تڑپ ہی سے ہے، دوستوں کو کٹواتا ہے مگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے، باپؑ کے ہاتھ میں چھری دیتا ہے کہ بیٹےؑ کو قتل کرے اور بیٹے سے کہتا ہے کہ خوش خوش گردن جھکا دے کہ یہاں جان دینا ہی نہیں بلکہ جان دینے کو روزِ عیش و نشاط سمجھنا بھی شرط ہے۔

آہ! ایں چہ دوستیست کہ سر ہائے یک دگر
خویشاں بُریدہ بر رہِ قاتل نہادہ اند

حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اپنی محبت کے ساتھ بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی اور اسماعیلؑ کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا تو محبت نفس و جان کی پرچھائیں نظر آئی۔

عشق است و ہزار بدگمانی

غیرتِ الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا، حکم ہوا کہ پہلے محبت کے مکان کو ایک ہی مکین کے لیے خالی کر دو، پھر اس طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا کہ ''الغیرة من صفات حضرت الربوبية'' محبت کی عشق آموزی کا پہلا سبق غیرت ہے اور یہی معنے ہیں اس آیت کریمہ کے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (اللہ تعالےٰ تمہارے گناہوں سے درگذر کر سکتا ہے، مگر اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ تم اس کی محبت میں کسی دوسرے کو شریک کرو)۔

سلطانِ محبت تمام گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون نہیں ہے اس کا آج بھی یہی قانون ہے اور وہ آج بھی اپنے ہر پرستار سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے جس کے مطالبہ کے لیے اس نے اب سے ہزاروں برس پہلے ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کے ذبح کر دینے کا حکم دیا تھا۔

آستانہ دہلی۔ جون ۱۹۶۱

☆☆☆

اُسوۂ حسینؑ

سچ یہ ہے کہ جن مُردہ دلوں کو زندگی کے لیے سوز وتپش کی ضرورت ہو، جن اربابِ درد کو روح کی راحت کے لیے جسم کے ماتم کی تلاش ہو، جن کی زبانیں آہ وفغاں کو محبوب اور جن کی آنکھیں خونبانہ فشانی کو اپنا مطلوب سمجھتی ہوں ان کی صحبتِ ماتم والم کی رونق کے لیے امامِ عالی مقام امام حسین علیہ السلام کا افسانہ اتنا کچھ سامانِ غم اپنے اندر رکھتا ہے کہ اگر خون کے بڑے بڑے سمندر سطحِ ارض پر اُبھر آئیں اور بے شمار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات یکسر جنبش میں آجائیں جب بھی اُن کی ندائے حال اس الہام سرائی سے قاصر رہے گی جو اس افسانہ کے ایک ایک لفظ کے اندر سے توصیہ فرمائے عبرت وبصیرت ہے۔

لیکن آہ کتنے دل ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بصائر ومعارف کے اندر دیکھا ہے اور کتنی آنکھیں ہیں جو حسینؑ ابنِ علی شہید پر گریہ وبُکا کرتے ہوئے اس اسوۂ حسنہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں جو اس حادثۂ عظمیٰ کے اندر موجود ہے؟

فی الحقیقت یہ حق وصداقت، آزادی وحُریت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی جو صرف اس لیے ہوئی تاکہ پیروانِ اسلام کے لیے ایک اُسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہادِ حق وعدالت اور ثبات واستقامت کی ہمیشہ کے لیے ایک کامل ترین مثال قائم کردے۔ پس جو بے خبر ہیں اُن کو رونا چاہیے۔ ان لم تبکوا فتباکوا۔ اور جو روتے ہیں اُن کو صرف رونے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے لیے سید الشہدؑ نے اپنی قربانی کا ایک اُسوۂ حسنہ پیش کردیا ہے اور کسی رُوح کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ محبتِ حسینؑ کی مدّعی ہو جب تک اُسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

اُسوۂ حسینی: ضرورت ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس حادثۂ شہادت پر نظر ڈالی جائے، سب سے پہلے اس کی تاریخی حیثیت نمایاں کرکے اس کے تمام مواعظ ونتائج عظیمہ کو ایک ایک کرکے بیان کیا جائے جو اس ''ذبحِ عظیم'' کے اندر پوشیدہ ہیں اور جن کی لسانِ حیات آج بھی اسی طرح صدا دے رہی ہے جس طرح ساحلِ فرات کی ریتلی سرزمین پر اب سے بارہ سو برس پہلے زخم وخون کے اندر سے وعظ فرمائے حقیقت وصداقت تھی۔ دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے، مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لیے جو اپنے اندر حیاتِ الٰہیہ کی رُوح رکھتے ہیں کبھی فنا نہیں۔

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

لیکن افسوس کہ شرح وبسط کے لیے وقت نہیں، اس لیے یہاں صرف چند مجمل اشارات پر اکتفا کروں گا۔

تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل

(ا) سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثۂ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے دعوت الی الحق اور حُریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرنا ہے۔

بنوامیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر وشخصیت پر ہو کبھی اسلامی حکومت نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور مشورۂ اجماعِ اُمت کی جگہ محض غلبۂ جابرانہ اور مکر وخدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظامِ حکومت شریعت الٰہیہ پر مبنی نہ تھا بلکہ محض اغراض نفسانیہ ومقاصد سیاسیہ پر اس کی تمام تر بنیاد تھی۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ ظلم وجبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق وحُریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا اور حضرت سید الشہدؑ نے اپنی قربانی کی مثال قائم کرکے مظالم بنی اُمیہ کے خلاف جہادِ حق کی بنیاد رکھی

اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا اعلانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حُریت وحقوق کی غارت گر ہو، اور جس کے احکام مستبدہ و جائرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم ہو۔

(۲) مقابلہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے ۔ کیوں کہ حسینؑ ابنِ علیؑ کے ساتھ چند ضعفاء و مساکین کی جمیعتِ قبیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا، حق و صداقت کی راہ، نتائج کی فکر سے بے پروا ہے، نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں، یہ اُس قوت قاہرہ عادلہَ الٰہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف و فقدان انصار کے کامیاب و فتح مند کرتی ہے۔ وَکَمْ مِنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً بِاِذْنِ اللّٰہِ۔

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مصلحت اندیشیوں کا خیال دامن گیر ہوتا ہے، جو اگرچہ فی نفسہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے، لیکن کبھی کبھی شیطان الرجیم بھی اس کے بھیس میں آکر کام کرنے لگتا ہے، نفس خادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں کٹوا دینے اور چند انسانوں کا خون بہا دینے سے کیا حاصل، توپ و تفنگ اور تخت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں؟

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں، تاریخ عالم کی صد ہا امثال مقدسہ و محرّمہ سے قطع نظر تمہارے سامنے خود شہید کربلا کی مثال موجود ہے تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومتوں کی قوتوں اور ساز و سامان کا مقابلہ کب کیا ہے کہ اب کیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ حسینؑ ابن علیؑ نے صرف ۷۲ یا ۶۲ بھوکے پیاسے انسانوں کے ساتھ اُس عظیم الشان حکومت قاہر و جابر کا مقابلہ کیا جس کے حدود سلطنت ملتان اور سرحدِ فرانس تک پھیلنے والے تھے۔ اور گو یہ سچ ہے کہ امامؑ نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا اور پھر ایک ایک کر کے

اُن میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا اور جاں بحق تسلیم ہوا اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے نہ تو پینے کا پانی چھین سکے اور نہ زندہ رہنے کے لیے اپنی غذا حاصل کر سکے اور اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے چُور ہوئے اور خلعتِ شہادت لالہ گوں سے آراستہ ہو کر تیار ہوئے تا کہ اس کے کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچیں ۔ جو دوستوں کو خاک و خون میں تڑپاتا اور دشمنوں کو مُہلت دیتا ہے۔

اريد وصاله وُيريد قتلی

تاہم فتح حسینؑ ابنِ علیؑ کی تھی اور فیروز مندی و کامرانی کا تاج صرف اس کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا، وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا، پر اس خون کے ایک ایک قطرہ نے جو عالم اضطراب میں اُس کے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیے جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی، نہ حجاج ثقفی کی بے اماں خونخواری اور نہ عبد الملک کی تدبیر و سیاست ان فتنوں پر کوئی بند باندھ سکی، وہ بڑھتے اور پھیلتے ہی رہے، ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان شعلوں کی پرورش کرتا رہا، اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک ایک چنگاری کو آتشکدہ سوزاں بناتا رہا یہاں تک کہ آخری وقت آ گیا اور جو کچھ ۶۱ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا وہ سب کچھ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالمِ اسلامی کے اندر ہوا، صاحبان تاج و تخت، خاک و خون میں تڑپے، اُن کی لاشیں گھوڑوں کے سُموں سے پامال کی گئیں۔ فتحمندوں نے قبریں تک اُکھاڑ ڈالیں اور مُردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا اور اس طرح فَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ کا پورا پورا ظہور ہوا۔

پھر کیا یہ سب کچھ جو ہوا وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابو اسلم خراسانی کی خفیہ ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ اسی خون کا اعجاز نہ تھا جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا؟ پھر یہ فتح مندی تو

ظاہری ہے جس کے ظہور کے لیے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے اسی وقت اپنی معنوی فتح مندی حاصل کر لیتا ہے۔

(۳) بہر حال یہ تو حق وصداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے لیکن حضرت سید الشہدؑا کا اُسوۂ حسنہ بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا بھی پروانہ کرو۔ اگر ظالم اور جابرانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لیے حق کی قربانی ناگزیر ہے۔ اور اسے ہونا ہی چاہیے۔ تعداد کی قلت وکثرت یا سامان ووسائل کا فقدان اُس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ اور ظلم کا صاحبِ شوکت وعظمت ہونا کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اس وجہ سے اس کی اطاعت ہی کر لی جائے، ظالم خواہ ضعیف ہو خواہ قوی، ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ظالم ہے۔

(۴) حق وعدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب رُبا ہیں، قدم قدم پر حفظِ جان وناموس اور محبت فرزند وعیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں لیکن یہ اُسوۂ حسنہ مومنین مخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب وہمت کو اچھی طرح آزمالیں تا کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر نہ لگے۔ جرم رااین جا عقوبت ہست واستغفار نیست

اس قتیل جادۂ حق وصداقت کے انصار کے پاس جو کچھ تھا اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے، خداتعالیٰ نے اپنی آزمائشوں کے متعدد درجے بیان کیے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ تمھیں آزمائشوں میں ڈالے گا۔ وہ حالت خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان مال و جان اور ہلاکت اولاد و اقارب اور پیدا وار کی کمی میں مبتلا کر کے تمہارے صبر واستقامت کو آزمائے گا۔ پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے اُن کے لیے جن کی

ثبات واستقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے معاملات کو یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

خوف وہراس، بھوک اور پیاس نقصان اموال ومتاع، قتل نفس واولاد یہی چیزیں انسان کے لیے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہوسکتی ہے۔ اس لیے انہی چیزوں کو راہِ الٰہی کے لیے آزمائش قرار دیا گیا۔

شہیدِ کربلاؑ کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کر کے موجود تھے اور وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پا کر آرام وراحت اور شوکت وعظمت حاصل کر سکتے تھے۔ اگر حکومت ظالمہ سے وفاداری واطاعت کا عہد کر لیتے اور حق وصداقت سے روگردانی کے لیے مصلحت وقت کی تاویل پر عمل کرتے مگر آپ نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی اور حق کا عشق زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا اور آپ نے اپنا سر دے دیا کہ انسان کے پاس حق کے لیے یہی ایک آخری متاع ہے اور اطاعت واقرار وفاداری کا ہاتھ نہ دیا جو صرف حق وعدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا، وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ۔

(۵) اُسوۂ حسنہ کے اس واقعۂ عظیمہ کی لسان حال اس کی ترجمانی کرتی ہے کہ راہِ مصائب وجہادِ حق میں بنیاد صبر واستقامت اور عزم وثبات ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْ۔ دوسری جگہ کہا۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ۔

فی الحقیقت اس شہادت عظیمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے تمام عزیز واقارب اہل وعیال اور فرزند واحباب کے ساتھ دشت غربت ومصائب میں محصور اعدا ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش وجوع سے آہ وفغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھر ان میں سے ایک ایک کی خون آلودہ لاش کو اپنے ہاتھوں سے اُٹھانا حتیٰ کہ اپنے طفل شیر خوار کو بھی تیر ظلم بربریت سے نخچیر پانا مگر بایں ہمہ راہِ عشق وصداقت میں جو پیمانِ صبر واستقامت باندھا تھا اس کا

ایک لمحہ بلکہ ایک دقیقہ کے لیے بھی متزلزل نہ ہونا اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب واندوہ پیش آئیں سب کو شکر و منت کے ساتھ برداشت کرنا کہ: رضينا بقضاء الله و صبرنا على بلائهِ۔

پیکانِ ترا بجاں خریدار　　　　من مرہم دیگراں نخواہم

دوست کے ہاتھ سے جامِ زہر بھی ملتا ہے تو تشنہ کامانِ زلال محبت اسے غیروں کے جامِ شہد و شکر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دیگراں

آج بھی اگر گوشِ حقیقت نیوش باز ہو تو خاکِ کربلا کا ایک ایک ذرہ توصیہ فرمائے صبر و استقامت ہے

شدیم خاک ولیکن بوئے تربت ما
تواں شناخت گزیں خاکِ مردم خیز

اگر اس صبر و استقامت کے اُسوۂ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہو تو خدارا تاریخ کی طرف توجہ کرو صرف ایک روایت یہاں لکھوں گا تا کہ جو لوگ خاندانِ نبوت اور عترت حضرتؐ رسالت کی محبت کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ غور کریں کہ ادعائے محبت بغیر متابعت بیکار ہے۔

حضرت امام علی بن حسین زین العابدین علیہ السلام کہتے ہیں، جس رات کی صبح کو میدانِ شہادت گرم ہونے والا تھا عین اسی وقت کا واقعہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا۔ میری پھوپی زینبؓ میری تیمارداری میں مصروف تھیں، اتنے میں حضرت امام حسینؑ داخل ہوئے وہ چند اشعار پڑھ رہے تھے جنھیں سُن کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلائے الٰہی نازل ہو گئی ہے اور اب اس سے چارہ نہیں، مگر حضرت زینبؑ ضبط نہ کر سکیں کیونکہ قدرتی طور پر عورتیں زیادہ رقیق القلب ہوتی ہیں وہ ماتم کناں چلا اُٹھیں، واحسرتا وامصيبتا اليوم ماتت فاطمه وعلى والحسين بن على۔ لیکن جب حضرت حسینؑ

نے یہ حالت دیکھی تو ان کی جانب متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: بہن! یہ کیا بے صبری اور یہ کیسا جزع و فزع ہے۔ اللہ سے ڈرو کہ موت یقیناً آنے والی چیز ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

لیکن حضرت زینبؓ شدت غم و حزن سے مضطر تھیں کہ آنے والی صبح کن واقعات خونیں کے ساتھ نازل ہو گی، فرطِ غم میں انھوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا، گریبان پھاڑ ڈالا، واویلا اور واحسرتا پکارتی ہوئی بیہوش ہو کر اپنے بھائی پر گر پڑیں۔ حضرت حسینؑ نے یہ حالت دیکھ کر اُن کے منہ پر پانی ڈالا اور جب ہوش میں آئیں تو فرمایا: اے بہن! یہ کیسا غم و حزن ہے جو تم کر رہی ہو؟ تمھیں چاہیے کہ اللہ کے حکم و فرمان کے مطابق جو طریق عزا حزن و غم ہے وہ اختیار کرو، کیوں کہ میرے لیے اور ہر ایک مسلم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے اعمال و افعال میں اتباع اور پیروی کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

اللہ اکبر! خاندان نبوت کے اس مرتبہ رفیع اور اس درجہ عظیم کو دیکھیے کہ رسولؐ اللہ کا اُسوۂ حسنہ کس طرح ان کے سامنے تھا اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کے حکم کے آگے کس طرح اُنھوں نے اپنے جذبات اور خواہشوں کو قربان کر دیا تھا؟ ایسے سخت اور زہرہ گداز موقعہ پر بھی اپنی بہن کا جزع و فزع اُنھیں گوارا نہ ہوا اور بجائے عام الفاظ صبر و تشفی کہنے کے فرمایا یہ کہ فَاِنَّ لِي بِكُلِّ مُسْلِمٍ أُسْوَةٌ فِي رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمْ۔

پھر آج کتنے مدعیانِ محبتِ اہلِ بیت کرام ہیں جو اس اُسوۂ حسنہ کے اتباع کا اپنے اعمال سے ثبوت دے سکتے ہیں؟

آستانہ دہلی ستمبر ۱۹۵۴ء

☆☆☆

شہادت حسین علیہ السلام

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا اور اشک بار آنکھوں سے پڑھا گیا۔ لیکن اس دردانگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعتِ اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اُسوۂ ہائے حسنہ مخفی تھے جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہالے گئے اور عبرت ونصیحت کی ایمانی صدائیں نالہ ہائے ماتم میں گم ہوگئیں، اس لیے اب ہم کو قدیم زمانہ کی مجلس ہائے ماتم میں ایک نئے حلقۂ ماتم کا اضافہ کرنا چاہیے اور خون آلود آنسوؤں کا جو چشمہ ہمارے زخم رسیدہ دلوں سے اُبل رہا ہے اُس کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر کے خود واقعہ شہادت کو اسرارِ شریعتِ اسلامیہ کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ماتم کرنے کا یہ ایک نتیجہ خیز طریق ہوگا اور شریعت نے امت محمدیہ کو اسی قسم کے طریقِ ماتم کی ہدایت فرمائی ہے۔

دنیا میں اسلاف پرستی کا فطری مادہ ہر قوم کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے، اسی بنا پر تمام قوموں نے اپنے اپنے اسلاف کا ماتم مختلف طریقوں سے پرمنایا ہے اور اُن کے اعمال کو آئندہ نسلوں کی عبرت وبصیرت کے لیے زندہ رکھنا چاہا ہے لیکن ان تمام طریقوں میں جو طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ وہی ہے جس کی بنیاد دنیا کی بُت پرستی نے رکھی اور در اصل اصنام پرستی کی زنجیر عمل کی پہلی اور آخری کڑی اسی کو سمجھنا چاہیے۔ پہلی اس لیے کے بسا اوقات انسانوں نے اسی راہ سے اصنام پرستی کی منزل پائی اور آخری اس لیے کہ بُت پرستی خود تو چلی گئی۔ مگر اپنا نقش قدم اس شکل میں چھوڑ گئی ہے۔

ہمارا اشارہ اسلاف پرستی کے اس طریقہ کی طرف ہے جس کی بناء پر مشاہیر ملک وقوم کے

مجسمے (اسٹیچوز) بنائے جاتے ہیں اور اُن کو اس لیے نصب کیا جاتا ہے تاکہ اُن کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ مشاہیر کی یاد دلائی جائے اور اُن کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت ملے۔

اگرچہ اسلاف پرستی کا یہ نہایت قدیم طریقہ تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ تک اس قسم کے متعدد مجسمے قائم ہو چکے تھے اور اُن کی علانیہ پرستش کی جاتی تھی۔ لیکن یونان ومصر نے ان مجسموں پر تہذیب وتمدن کا آب ورنگ چڑھا کر ان کو اور بھی شاندار دلفریب بنا دیا۔ آج یورپ بانیانِ تہذیب وتمدن کے دیوتاؤں کی جو نمائش مجسموں کی شکل میں کر رہا ہے اُن کے اندر یونان کی اس قدیم تہذیب کا عکس صاف نظر آتا ہے، ہندوؤں کی مذہبی سطح پر بھی تصویروں کی جو صفیں نظر آ رہی ہیں اُن میں بھی اسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

لیکن اسلام ایک دین خالص تھا جو توحید خالص کو قائم کرنا چاہتا تھا پس وہ کسی طرح بھی قیام ذکر وبقائے عظمت کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا جس میں پڑ کر دُنیا بار بار ٹھوکر کھا چکی تھی۔ اسلام نے ظاہر ہوتے ہی دنیا کے تمام اعمال ومعمولات پر نظر ڈالی اور ہر عمل کی حقیقت وروح کو لے لیا اور غیر مناسب اور ناموزوں جسم ولباس کو چھوڑ دیا وحشت نے جن حقیقتوں کو تاریک پردوں میں چھپا دیا تھا وہ دفعتاً چاک ہو گئے جہالت نے جن موتیوں کو پتھروں کے ڈھیر میں گم کر دیا تھا وہ اُس سے الگ ہو کر دنیا کے دامنِ مُراد میں آ گئے۔ قرآن حکیم نے اسی انقلاب کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ط (خدا مسلمانوں کا دوست وساتھی ہے، اُن کو ہر طرح کی تاریکیوں سے نکال کر فطرت صالحہ کی ربانی روشنی میں لاتا ہے مگر کفار کے دوست اُن کے طاغوت ہیں جو اُن کو خدا کی بخشی ہوئی روشنی سے نکال کر جہل وضلالت کے اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔)

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس کی جھلک اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتی ہے اور مشاہیر پر ماتم کرنے کا طریقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے چناں چہ قدماء کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے اعمال و آثار کے زندہ رکھنے کا جو طریقہ زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا اسلام نے اُس میں بھی ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیا اُس نے مسلمانوں کو مجسموں کی شکل میں اسلاف پرستی کی اجازت نہیں دی کیوں کہ وہ بُت پرستی تک منجر ہوتی ہے اور اسلام زندہ انسانوں کے سروں کو پتھروں کے آگے نہیں جھکانا چاہتا مگر اُس نے مشاہیر کرام اور اسلام صالحین کے نمونوں کے فوائد عظیمہ کو بھی ضائع نہ ہونے دیا اور اُن کے اثر کو اس طرح حی و قیوم کر دیا کہ ہر مومن کے آگے اُن کے عملی زندگی کے نمونے پیش کر دیے اور کہا کہ دن میں پانچ بار جب خدا کے حضور آؤ تو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت مانگو اور ساتھ ہی تشریح کر دی کہ صراطِ مستقیم انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین کی راہِ علم و عمل ہے اور اس لیے اُن کے نمونے ہر وقت تمہارے سامنے رہنے چاہئیں۔

پس ماتم کی رسم پر وحشت نے جن تاریک پردوں کو ڈال کر اصل حقیقت کو چھپا دیا تھا اور تمدن و تہذیب نے ان پردوں پر نظر فریب رنگ چڑھا کر جن بصیرتوں کو گم کر دیا تھا۔ اسلام نے ان سب کو چاک کر دیا اور مغز حقیقت جن چھلکوں میں چھپا ہوا تھا اُن سے نکل کر آشکارا ہو گیا۔

قرآن حکیم میں انبیاءِ سابقین کے جو قصص مذکور ہیں اُن کے اندر درحقیقت انہی بصائر و حکم کی روح مضمر ہے جو مجسموں کے قالب میں حلول کر کے بالکل بے اثر اور محض ظاہر فریب ہو جاتی تھی، قرآن مجید قدماء و اعاظم رجال کی یادگاروں سے قائم کرنے کے اصل مقصد کو ''اُسوہ حسنہ'' کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور مسلمانوں کو جا بجا اس پر توجہ دلاتا ہے۔ چناں چہ تم نے بار بار پڑھا ہوگا کہ اُس نے خلیل اللہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے نمونہ حیات کو مسلمانوں کا قبلۂ وجود و کعبہ انظار قرار دیا ہے۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (تمہارے لیے حضرت

ابراہیمؑ کی حیات طیبہ میں اور ان کی زندگی میں جو اُن کے ساتھی ہیں بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔)

اس بناء پر اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو صحیح اصول پر حق پرستی کی تعلیم دیتا ہے اور اسی صحیح اصول کے مطابق چاہیے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعہ شہادت کے اندر عزم و استقلال صبر و ثبات، استبداد شکنی، قیام جمہوریت امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی جو عظیم الشان بصیرتیں موجود ہیں اُس کی یاد کو ہر دم تازہ رکھیں۔ اور کم از کم سال میں ایک بار اس مذہبی قربانی کی روح کو تمام قوم میں ساری و جاری کر دیں۔

لیکن ان بصیرتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات میں ایک اور عظیم الشان بصیرت موجود ہے جس کا سلسلہ مذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور اُس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل سے جا کر مل جاتی ہے۔ دنیا کی مذہبی تاریخ کی ابتداء عجیب بے کسی کی حالت میں ہوئی ہم نے دنیا کے سخت سے سخت معرکوں میں باپ کو بیٹے کا شریک، بھائی کو بھائی کا حامی، بیوی کو شوہر کا مددگار پایا ہے لیکن صرف مذہب ہی کا روحانی عالم ایک ایسا عالم ہے جہاں باپ کو بیٹے نے، بھائی کو بھائی نے شوہر کو بیوی نے چھوڑ دیا ہے بلکہ اُن کی مصیبتوں میں اضافہ کیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ خاندان نبوت ہمیشہ عزیز و اقارب کی اعانت سے محروم رہا، حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت تک شب و روز اپنی قوم کو دعوت توحید دی اور قوم نے بغض و عناد سے اُن کی دعوت حق کو رد کر دیا، اُن سے علیحدگی اختیار کر لی اور کانوں میں اُنگلیاں تک دے لیں۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ط (نوحؑ نے عرض کیا۔ ''خداوندا! میں نے شب و روز قوم کو دعوت حق دی لیکن اُس کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ لوگ مجھ سے اور زیادہ بھاگنے لگے میں نے اُن کو جب تیری مغفرت کے لیے پکارا اُنہوں نے کانوں میں انگلیاں

ڈال لیں، اپنے کپڑوں میں لپٹ گئے کہ اُن تک میری آواز نہ پہونچ جائے۔ آہ! یہ حق ناشناس قوم ہمیشہ ہٹ دھرمی اور باطل پرستانہ گھمنڈ کا اظہار کرتی رہی۔)

لیکن اس پیغمبرانہ آواز کی صدائے بازگشت صرف اُن کی قوم ہی کہ درو دیوار سے ٹکرا کر ناکامیاب واپس نہیں آئی بلکہ خود اُن کے گھر کے درو دیوار نے بھی اُس کو ٹھوکر لگائی اور خاندانِ نبوّت کے چشم و چراغ یعنی اُن کے بیٹے نے بھی اس نور کو قبول نہ کیا۔ آخری وقت میں حضرت نوح علیہ السلام نے پھر اپنے بیٹے کو خدا کی پناہ میں بُلایا۔ لیکن اُس وقت بھی اُس کا گوشِ نصیحت نیوش دانہ ہوا، اس لیے وہ بھی تمام قوم کے ساتھ عذابِ الٰہی کی طوفان خیز موجوں میں بہہ گیا۔ وَنَادٰی نُوْحُ نِ ابْنَہٗ وَ کَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَعَنَا وَلَا تَکُنْ مَّعَ الْکٰفِرِیْنَ ط قَالَ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ تَعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَیْنَھُمَا الْمَوْجُ وَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ط (اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا وہ کنارہ پر کھڑا تھا، اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا۔ کافروں کا ساتھ نہ دے اُس نے کہا میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا اور وہ مجھے پانی کی زد سے بچا لے گا۔ نوحؑ نے کہا کہ تو کس خیالِ خام میں پڑا ہے، آج خدا کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔) چنانچہ نوحؑ کی پکار کچھ سودمند نہ ہوئی اور اُن کے اور اُن کے بیٹے کے درمیان موج حائل ہو گئی اور تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے تمام خاندان نے اگرچہ اُن کا ساتھ دیا لیکن خود اُن کی بیوی اُن سے علیحدہ ہو کر تمام قوم کے ساتھ عذابِ الٰہی میں شامل ہو گئی، قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا امْرَاَتَہٗ قَدَّرْنَآ اِنَّھَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۱۵:پ) (فرشتگانِ عذاب نے کہا۔ ''ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں جو ہلاک ہونے والی ہے، مگر ہاں، ایک خاندان وہاں لوطؑ کا ہے اس کے تمام افراد کو ہم بچا لیں گے، مگر اُس کی بیوی نہیں

بچے گی اس لیے کہ ہمارا اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ بھی پیچھے رہنے والوں کا ساتھ دے گی۔)

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے خاندان نبوت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اُن سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ حضرت لوطؑ علیہ السلام کی بیوی نے اُن سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ لیکن اس دورِ ابراہیمیؑ میں بیٹے نے باپ کی، بیوی نے شوہر کی، بھائی نے بھائی کی دعوتِ حق پر لبیک کی صدا بلند کی اور اس دعوت کی اشاعت میں اُن پر جتنی مصیبتیں..... آئیں اُن میں برابر کے شریک رہے سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جہادِ روحانی کی طرف قدم بڑھایا اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے لختِ جگر کو ایک ''وادی غیر ذی زرع'' میں ڈال دیا۔ جہاں کئی سو میل تک آب و گیاہ کا پتہ نہ تھا۔ یہ اسی سخت امتحان کی پہلی منزل تھی جس کے لیے خداوند تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا۔ چناں چہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا تو اُنہوں نے باپ کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ط فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ وَنَادَیْنٰہُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ o اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ o (جب اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو اُنہوں نے ایک دن کہا۔ ''اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تمہیں راہِ حق میں ذبح کر رہا ہوں .... تم اس پر غور کرو کہ اب کیا کرنا چاہیے؟'' بیٹے نے بلا تامل کہا ''اے میرے باپ! آپ خدا کے حکم کو پورا کیجیے، مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے'' جب باپ بیٹے دونوں خدا کے آگے جھک گئے اور باپ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو زمین پر پچھاڑا تو اُس وقت ہم نے آواز دی اے ابراہیمؑ! بس کرو، تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم صاحبانِ احسان کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ دراصل یہ ایک بہت بڑی قربانی تھی جس کے لیے وہ

تیار ہو گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی اُن کے خاندان کی اعانت ورفاقت شریک رہی چناں چہ جب اُن کو شعلہ طور کی زبان نے بشارت نبوت دی تو اُن کی بیوی اُن کے ساتھ تھیں، بلکہ انہیں کے لیے وہ آتش کدہ طور سے آگ لینے گئے تھے۔ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ (جب موسیٰ مدین سے اپنی بیوی کو لے چلے تو اُن کو کوہِ طور کے دامن میں آگ کی روشنی نظر آئی تو اُنہوں نے اپنی بیوی سے کہا، تم یہیں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے اُس کا پتہ لگاتا ہوں شاید تمہارے تاپنے کے لیے آگ حاصل کرسکوں)

لیکن وادیِ ایمن میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک برق خاطف تھی جو فرعون کے خرمنِ ظلم واستبداد پر گرنا چاہتی تھی، چنانچہ جب خدا نے عصا اور ید بیضا کی صورت میں اُن کو یہ صاعقہ ہلاکت دیا اور اُنہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ کی اعانت کا سوال کیا تو خدا نے اُسے پورا کیا۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا (خدا نے کہا: میں تیرے دست وبازو کو تیرے بھائی کی اعانت سے قوی کر دوں گا اور تم دونوں کو فرعون پر غالب کروں گا)

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے آغاز کار سے انجام کار تک حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا اور دعوتِ موسوی کے ہمیشہ شریک وامین رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اسی سلسلہ کو اور ترقی ہوئی پہلے خدا کے ایک صالح بندہؒ نے اپنے بیٹے کو خدا کی مرضی پر قربان کرنا چاہا تھا لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے قربانی کے جامِ مقدس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُن کے لیے سولی کا جو تختہ تیار کیا گیا تھا اُس کی طرف بلا کسی باک کے بڑھے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (اور ان لوگوں نے نہ عیسیٰ

علیہ السلام کو قتل کیا نہ پھانسی دی بلکہ اُن پر اُس قربانی کی حقیقت مشتبہ ہوگئی۔)

لیکن اسلام کے زمانہ تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوئی تھیں وہ محض شخصی حیثیت رکھتی تھیں۔ یعنی انبیاءؑ نے شخصی طور پر اپنی اولاد کو یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا، جہاد کی یہ ابتداء تھی مگر اس کی تکمیل شریعتِ اسلام پر موقوف تھی، چناں چہ اسلام نے جس طرح عقائد وعبادات اور معاش ومعاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی اُسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا۔

اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شخصی طور پر جو قربانیاں کی گئیں وہ راہ ہی میں روک لی گئیں، حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے اپنے لختِ جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا، لیکن اس کا موقع ہی نہ آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی کی طرف بڑھے لیکن بچا لیے گئے۔ آج تک تمام خاندانِ نبوت نے متفقہ طور پر اُس میں شرکت بھی نہیں کی تھی اور اس کی کوئی نظیر سلسلۂ انبیاءؑ میں بھی نظر نہیں آتی تھی اور صرف بھائی، صرف بیٹا، صرف بیوی ہی نے مقصدِ نبوت میں ساتھ نہ دیا ہو بلکہ بلا تمیز خورد وکلاں خاندانِ نبوت کے جملہ اعزا اور ارکان راہِ حق میں قربان ہوئے ہوں۔

یزید کی شخصی حکومت کی بیعت کے لیے جو ہاتھ بڑھے تھے وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اور مذہب کی قربانیاں صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے جب اُسوۂ ابراہیمیؑ کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آ گیا تو خاندانِ نبوت کے زن ومرد، بال بچے، غرض ہر فرد نے اُس میں حصہ لیا اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آغوش خالی تھی ان سے کربلا کا میدان لال رنگ بنا دیا گیا۔

پس حضرت امام حسین علیہ السلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے اس کا تعلق صرف اسلام کی تاریخ ہی سے نہیں ہے بلکہ اسلام کی اصل حقیقت سے ہے یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات

تک پہونچ کر گُم ہوگئی تھی، اُس کو حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندانِ نبوت دُنیا کے آباد کرنے کے لیے ہمیشہ اُجڑ تا رہا۔ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے ہجرت کی، حضرت موسٰی علیہ السلام نے گھربار چھوڑا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے صحرانوردی کی اور نبوت محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے خاندانِ نبوت کا سلسلہ ملا ہوا ہے اُنہوں نے ایک وادی غیر ذی زرع میں شدت تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ حضرت حسین علیہ السلام نے بھی میدان کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا............!

آستانہ دہلی ستمبر ۱۹۵۸ء

☆☆☆

عظیم الشان قربانی

تسلیم رضا کا ایک سنہری باب

دنیا کی بیماریاں ہمیشہ یکساں رہی ہیں، اس لیے آج ان کا علاج بھی اصولاً ایک ہی ہونا چاہیے۔ وہ جب کبھی متلاشی ہوئی ہے تو اُس کی تلاش جستجو سے کبھی مختلف نہ تھی، یہ جستجو جو کہ آج ہمیں درپیش ہے۔

ایک ہی چیز تھی جس کی ہمیشہ تلاش رہی ہم بھی آج اُسی کو ڈھونڈیں گے جب کہ اُسی زمین پر اسے ہزاروں برس پہلے خدا کے ایک مخلص بندے نے اُس کو درد اور تڑپ کی آواز میں پکارا تھا اور کہا تھا کہ، خدایا: میں نے اپنی قوم کو رات دن حق وہدایت کی دعوت دی لیکن افسوس کہ میری دعوت کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ نکلا کہ وہ مجھ سے بھاگنے لگی، میں نے جب کبھی ان کو پکارا تا کہ وہ تیری طرف رجوع ہوں تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ کہیں میری آواز سن لیں اور اپنے اوپر سے کپڑے اوڑھ لیے کہ کہیں میرے چہرے پر نظر نہ پڑ جائے اور ضد اور شیخی میں آ کر اکڑ بیٹھے۔ اس پر بھی میں باز نہ آیا۔ پھر انہیں پکار پکار کر تیرا پیغام پہنچایا، اور اس کے بعد بھی ظاہر و پوشیدہ ہر طرح سمجھا یا لیکن خدایا: با این ہمہ سعی و دعوت و اصلاح، ان سرکشوں نے میرا نہ مانا اور انہی معبودان باطل کی غلامی کرتے رہے، جنھوں نے ان کے مال اور ان کی اولاد کو فائدہ کی جگہ الٹا نقصان ہی پہنچایا تو وہ بھی اپنی قوم کو اُسی کی تلاش کا پتہ دے رہا تھا۔

(۲)

جب کہ کالڈیا کے بُت خانے میں ایک برگزیدہ نوجوان نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر

کا فرض ادا کیا۔ جب کہ اس نے اپنے ہاتھ میں چھری لی۔ اور اپنے فرزند عزیز کو محبت الٰہی کی بے خودی میں دشمنوں کی طرح زمین پر دے پٹکا۔ جب کہ اس نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے خاندان کو دینِ الٰہی کی پیروی کی وصیت کی اور کہا۔ دیکھو: اللہ نے تمہارے اس دین اسلام کو تمہارے لیے پسند فرمایا۔ پس ہمیشہ اسی پر قائم رہنا اور دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔

تو اُس نے بھی اُسی کو ڈھونڈا اور پایا تھا۔

(۳)

جب کہ تخت گاہ فراعنہ کے ایک قید خانہ میں کنعان کے قیدی نے دین الٰہی کا وعظ کہا اور جب کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ

''اے یارانِ مجلس: بہت سے ممالک اور آقا بنا لینا اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے آگے جُھکنا؟ تم جو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی پرستش کر رہے ہو۔ تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے پیش رووں نے گھڑ لیے ہیں؟ حالاں کہ خدا نے تو اس کے لیے کوئی سند بھیجی نہیں۔

اے گمراہو: یقین کرو کہ تمام جہان میں حکومت صرف اُس خدا کے لیے ہے اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اُسی کے آگے جھکو: یہی اسلام کا سیدھا راستہ ہے لیکن افسوس کہ اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔''

تو اس کی نظر بھی اسی کی طرف تھی اور اسی کی تلاش تھی جس کا وہ سراغ دے رہا تھا۔

(۴)

وہ ''شاطی وادی ایمن'' اور بقعہ مبارکہ'' کا مقدس چرواہا، جب کہ کوہ سینا کے کنارے۔ انا اللہ رب العالمین کی ندا، محبت سے مخاطب ہوا تھا۔ اور جب کہ ایک ظالم وجابر حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے اس نے یکہ وتنہا فرمانروائے عہد کے سامنے حریفانہ کھڑے ہو کر پیشن گوئی کی

تھی کہ ''یعنی اے لوگو! مجھ کو جھٹلانے میں جلدی نہ کرو۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کون شخص اس کی طرف سے سچائی لے کر آیا، اور آخر کار کس کے ہاتھ نتیجہ کی کامیابی آنے والی ہے۔'' یقین کرو۔ کہ خدا کبھی ان لوگوں کو فلاح نہیں دیتا، جو برسر ناحق ہیں۔

تو وہ بھی اسی تلاش کا اعلان کر رہا تھا اور یہی تلاش تھی جس نے اسے منزل مقصود تک پہنچا دیا تھا۔

(۵)

وہ۔ ناصرہ کا نوجوان اسرائیلی جو پچھلی کتابوں کی پیشن گوئی کے مطابق آیا تھا۔ تا کہ عہد اسرائیل کے خاتمہ اور دور اسماعیل کے آغاز کا اعلان کرے۔ اور جب کہ اس نے چلنے سے پیشتر ایک باغ کے گوشے میں اپنے نادان اور ناسمجھ ساتھیوں سے کہا تھا۔

''میں اللہ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، میں کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آیا ہوں، بلکہ میرا کام صرف یہ ہے کہ کتاب تورات کی جو مجھ سے پہلے آچکی ہے۔ تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں۔ جو میرے بعد آئے گا۔ اور جس کا نام احمد ہوگا۔''

تو وہ بھی اسی وادیٔ جستجو کا ایک کامیاب قدم شوق تھا اور یہی گوہر مقصود تھا جس کے لیے اُس نے اپنے بے عقل ساتھیوں کے جیب و دامن کو بے قرار دیکھنا چاہا تھا۔

(۶)

اور پھر وہ ظہور انسانیت کبریٰ، وہ مجسمۂ نعمتِ الٰہیہ عظمٰی وہ معلم کتاب وحکمت وہ مزکی نفوس انسانیت، وہ ہادی الیٰ صراط مستقیم وہ مخاطب، ''انکَ تعلٰی خلقِ عظیم'' کا وہ تاجدار کشورستان یزداں پرستی، وہ فتح یاب، اقلیم، قلوب انسانی، وہ علم آموز، درسگاہ، ''ادبنی ربی فاحسن تادیبی'' وہ خلوت نشیں شبستان ابیت عند ربی ھو لطیعنی یعنی وہ جزو اعظم واقدس جس کے لیے دشتِ حجاز میں

ابراہیم خلیلؑ نے اپنے خدا کو پکارا ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلو علیھم آیاتہ و یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم (۱۲-۱۳)

جس کے نور مبین کی تجلی فاران کی چوٹیوں پر موسیٰؑ نے دیکھی جس کے عشق میں داؤدؑ نے نغمہ سرائی کی جس کے جمال الٰہی کی تقدس میں سلیمانؑ اپنے تخت جلال پر جھک گیا جس طرف یوحنا سے پوچھنے والوں نے بے قرار والہانہ اشارہ کیا۔ اور جس کے لیے ناصرہ کے اسرائیلی نبی نے اپنا جانا ہی بہتر سمجھا۔ اپنے باپ سے جو آسمان پر ہے سفارش کرے اور اس کو جو آنے والا ہے۔ یا بھیج دے۔ (یوحنا، ۱۸۱۶)

غرض جب وہ آنے والا آیا۔ اور خدا کی زمین آخری مرتبہ سنواری گئی تا کہ اس کی ابدی حکومت وجلال کا تخت بچھے اور اس کے فرمانِ آخری کا اعلان ہو۔

اب سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی اور اس کے تمام کاموں کا آخری نتیجہ نامرادی ہوگا۔ تو وہ بھی اس کی جستجو میں نکلا تھا۔ جن کی جستجو میں سب نکلے اور قبل اس کے کہ وہ اس کے لیے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اور اے پیغمبر! ہم نے تم کو دیکھا، کہ ہماری تلاش میں سرگردان ہو۔ پس ہم نے خود ہی تم کو اپنی راہ دکھائی۔

(۷)

غرض کہ دنیا کی حیات و ہدایت کی تاریخ یکسر تلاش و جستجو ہے۔ اس نے اپنے ہر دور میں کھویا اور پھر ہر دور میں اس کی تلاش کے لیے نکلی تو اسی کی تلاش کا ولولہ لے کر اٹھی اس کے ہادیوں نے جب اس کا ہاتھ پکڑا تو اسی جستجو میں نکلنے کے لیے پکڑا اس کی یہ تلاش ہمیشہ کامیاب رہی۔

اور جب بھی کبھی میسر نہ ہوئی البتہ تشنگی کا ثبوت ہمیشہ مانگا گیا۔

جمال حال شود ترمبہان استحقاق
دلیل آب جگر تفنگی وتشنہ بہی ست

لیکن یہ انقلاب عظیم جو ہیئت انسانیت میں ہوا۔ جس نے دنیا کو یکسر بدل دیا۔ اور جس عزیز و گم گشتہ کو وہ بھول بیٹھی تھی اس کی تلاش جستجو میں گم ہو کر پھر نمودار ہوئی کس چیز کا نتیجہ تھا!

یقیناً وہ ایک صدائے الٰہی تھی۔ لیکن کن کے اندر سے اٹھی کچھ شک نہیں کہ وہ جمال ربانی کی ایک بے نقاب بخشش نظارہ تھی لیکن اس جلوہ ریزی کا آفتاب، کن کے سیماء وجوہ پر چمکا؟

ان کے، جن کی نسبت کہا گیا۔ کہ سیمٰھم فی وجوھھم من اثر السجود

اصل یہ ہے کہ وہ ایک جماعت تھی۔ اور تاریخ اصلاح عام میں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر مرد عورت وانقلاب نے سب سے پہلے جماعت ہی کو پیدا کیا ہے۔ دعوت الٰہی اگر کوئی بیج ہے تو اس کے درخت کی پہلی شاخ جماعت ہی ہے۔ دنیا میں جب کبھی کوئی اصلاح تغیر ہوا ہے تو محض تعلیمات سے نہیں ہوا ہے جو ان تعلیمات کی حامل محافظ تھی وہ صدائیں جو محض زبانوں سے اٹھتی ہیں ہوا کی منجمد سطح میں تموج پیدا کر سکتی ہیں۔ مگر دلوں کے سمندروں میں لہریں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ کان ان کو سنتے ہیں پر دل ان کے آگے مسجود نہیں ہوتے۔

پس اصلاح عالم کا یہ آخری ظہور جس نے دین نبی کو اس کے قدیمی نام ''اسلام'' کے ساتھ پیش کیا۔ یہ بھی دنیا میں اسی لیے آیا تا کہ ایک جماعت پیدا کرے۔ اور اس نے ''جماعت'' پیدا کی یہی جماعت تھی جس کو خدا نے اپنے کاموں کے لیے چن لیا۔'' اور اس کے دلوں کو اپنے جمال و صفات الٰہیہ کا مسکن بنایا۔ عشق الٰہی کی وہ آتش مقدس جس کے لیے (نوح) نے لکڑیاں چنیں۔ جس کو ابراہیم خلیلؑ نے اپنے دامن قربانی سے ہوا دی۔ جس کی چنگاریاں وادی، ایمن، کی تاریکی میں

چمکیں۔ جس کے شعلوں کے لیے (مسیح) کی قربانی کے خون نے تیل کا کام دیا۔ اور جو بالآخر جبل ابو قبیس کے غاروں میں ''سراجاً منیرا'' بن کر بھڑکی۔ اس کے شعلوں سے اس جماعت الٰہی نے اپنے دلوں کی انگیٹھیوں کو روشن کر لیا تھا اور یہ انگیٹھیاں گو تعداد میں قلیل اور دنیا کی کیسی تاریکی وسیع و عالمگیر تھی۔ لیکن انہی سے دعوت و اصلاح کے وہ لاتعداد چراغ روشن ہوئے جن میں سے ایک چراغ زمین کے بڑے بڑے رقبوں اور انسانوں کی بڑی بڑی آبادیوں میں آفتاب جہاں تاب بن کر ظلمت دبائے عالم ہوا۔

یہی وہ خدا کی روشنی تھی جو اس جماعت میں سے ہو کر چمکی اور جس کو خدا نے نور اللہ کے لقب سے یاد کیا۔

میرا مقصود تاریخ دعوت اسلامیہ کی اُس اولین جماعت سے ہے۔ جس نے حضرت ابراہیم خلیل کے ساتھیوں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ اور اجمال نبوت کے ذریعہ خود اپنے اندر خصائص و برکات نبوت پیدا کر لیے۔

ترجمہ:۔ محمدؐ الرسول اللہ اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں دشمنان حق کے مقابلے میں نہایت ہی سخت مگر آپس میں رحمدل ان کو تم ہمیشہ اللہ کے آگے عالم رکوع و سجدہ میں دیکھو گے کہ اُس کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرت سجدہ کی وجہ سے نشان بن گئے ہیں۔

یہی جماعت تھی جس کے الٰہی کاروبار کو حضرت مسیح نے آسمان کی بادشاہت سے تعبیر کیا کیونکہ فی الحقیقت دنیا کو قوائے شیطانیہ کے تسلط سے نکالنے والی تھی۔ اور اسی کے اعمال کے ذریعہ دنیا میں خدا کا سخت عدل و اصلاح بھیجنے والا تھا۔ وہ ایک بیج تھا جو بوتے وقت گو حقیر اور بہت چھوٹا مگر بار آور ہونے کے بعد ایک درخت وسیع و تناور بننے والا تھا۔ اسی لیے مسیح نے اس تمثیل میں بیان

کیا کہ۔ آسمان کی بادشاہت رائی کے دانے کی مانند ہے جسے ایک شخص نے لے کر اپنے کھیت میں بویا وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہے پر جب اگتا ہے تو سب کلیوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے امن کی ڈالیوں پر بسیرا لیتے ہیں۔ (میتی ۱۳:۳)

چناں چہ پچھلی آیت میں اسی تمثیل کی طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا ہے

ترجمہ:۔ یہی جماعت ہے جس کو تورات اور انجیل میں ایک کھیتی سے تمثیل دی ہے۔

دیکھو! آسمان کی بادشاہت کا یہ بیج جو بویا گیا۔ فی الحقیقت کیسا حقیر تھا؟ ایک جماعت قلیل و حقیر جس کو نہ ساز و سامان دنیوی حاصل تھا۔ اور نہ کسی طرح دنیوی ریاست نہ عزت نہ اس کے پاس آلاتِ جنگ تھے نہ مسلح فوج۔''

خاص نمبر نشان منزل فروری ۱۹۷۸ء

☆☆☆

دعوتِ عزم وعمل

هـذا بـصـائـر الـلـنـاس و هدی ورحمة لقوم یوقنون : یہ تبلیغ دعوت لوگوں کے لیے عقل وبصیرت اور موعظتہ وحکمت کا مجموعہ ہے اور جو لوگ اللہ کے احکام پر یقین وایمان رکھتے ہیں ان کے لیے سرتا پا ہدایت ورحمت ہے۔

وانیبـوالی ربکم واسلمو اله من قبل ان یاتیکم العذاب ثم لا ینصرون : اے وہ لوگو! کہ اپنے پروردگار کی نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے ہو اس کی طرف رجوع کرو اور اس کے حکم کے آگے اپنی گردن جھکا دو، قبل اس کے کہ تم پر (آخری) عذاب نازل ہو اور کسی طرف سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔

واتبعوا احسن ماانزل الیکم من ربکم من قبل ان یاتیکم العذاب بغتة وانتم لا تشعرون ان تقول نفس یا حسرتا علی مافرطت فی جنب اللّٰه ۔

او تـقـول لو ان اللّٰه هدانی لکنت من امتقین او تقول خین تری العذاب لو ان لـی کـرـة فـاکون من المحسنین بلی قد جاء تك ابانی فکذبت بها واستکبرت و کنت من المتکبرین ط

اللہ کی طرف سے جو بہترین احکام ومواعظ بھیجے گئے ہیں ان کی پیروی کرو مگر اس وقتِ الیم سے پہلے جب کہ یکا یک تم کو آخری ناکامیوں اور نامرادیوں کا عذاب آگھیرے گا اور تم بالکل بے خبر ہو گے! ایسا نہ ہو کہ اس وقت حسرت وندامت کے ساتھ اس وقتِ فرصت کو یاد کرو اور تم میں سے کوئی کہے کہ آہ! ثم آہ!! صد حسرت وافسوس، میری اس کوتاہی پر جو میں نے اپنے پروردگار کے احکام کی

تقدیس واحترام کرنے میں کی!

یا کہے کہ اگر خدا میری ہدایت فرماتا تو میں بھی آج پرہیزگاروں میں سے ہوتا۔ حالاں کہ اسی اتمام حجت کے لیے آج ہدایت کی صدائے دعوت بلند کی جارہی ہے یا پھر جب وہ آنے والا عذاب سامنے آموجود ہو تو اس کو دیکھ کر حسرت سے کہے کہ اے کاش! مجھ کو گئی ہوئی مہلت اور گذرا ہوا وقت پھر دوبارا مل جاتا تو میں بھی نیک بن کر نیکوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا، لیکن اس وقت صدائے الٰہی اُٹھے گی کہ ہاں پہلے میں نے تو اپنا حکم بھیجا تھا اور اپنی نشانیاں تجھے دکھلائی تھیں، پر تو نے ان کو جھٹلایا اور ان کے آگے جھکنے کی جگہ مغرور ہو گیا۔ میرے حکموں سے انکار کرنے والوں میں سے تو ہی تھا، اب تیرے لیے حسرت ونامرادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اے وہ لوگو! کہ اپنے غفلت کدوں میں سرشار خوابِ بے خبری ہو! تمہیں معلوم ہے کہ آسمان کے نیچے تمہارے لیے کیسی کیسی بربادیاں اور ہلاکتیں آنے والی ہیں، پھر لوگوں کو پانی کی تلاش میں دوڑنا چاہیے، اگر ان کے گھروں کی دیواروں میں آگ لگ جائے تو اے عزیز انِ غفلت شعار واے سرگشتگانِ نشۂ بے خبری وخمار! خدارا بتلاؤ کہ میں کیوں تمہاری غفلت کے بستروں کو خالی اور تمہارے پائے عمل میں حرکت نہیں دیکھتا؟ اگر تم اپنی انتہائی بربادی کے منتظر تھے تو آہ، تم آہ! کہ اس بربادی کا آخری وقت آ گیا، اگر تمہاری خواہش تھی کہ ذلت ونکبت کی انتہا کو اپنی ان آنکھوں سے جو عزت وعظمت ہی کے نظارۂ وحید کے لیے پیدا ہوئی تھیں دیکھ لو تو اس کا وقت بھی آ گیا پھر کیا ہے، جس نے تم کو غفلت میں گرفتار کر دیا ہے؟ اور وہ کونسا قہرِ الٰہی ہے جس کا انتظار تمہیں اپنے مرکزِ غفلت سے ہلنے نہیں دیتا۔

فکرِ جان ومال تا چند؟ اور جستجوئے عیش وراحت تا کجے واعـلـموا انـمـا امـوالـکـم واولادکـم فتنـه ط واللّٰه عندهٗ اجرٌ عظیم وہ زندگی جس میں اپنی ملت اور اپنے خدائے ملت کا

کوئی حصہ نہ ہو عیشِ زندگی نہیں بلکہ ایک لعنت کونین ہے۔ یہ عیشِ نفس اور فکرو جان و مال کی زندگی جس کی بوجھل زنجیریں تم نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، کیا ہیں؟ سوا اس کے کہ ایک لہو ولعبِ نفسانی ہے، جس کا کوئی اثر باقی رہنے والا نہیں ہے اور آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اگر تم سمجھو اور غور کرو۔

کیا تم بھول گئے کہ جس متاعِ فانی کی خاطر چڑیوں کی طرح آشیانے اور چارپایوں کی طرح آذوقہ ڈھونڈتے ہو وہ بایں ہمہ شورش وکشاکش ایک نہ ایک دن جانے ہی والی ہے اور تم اس کی خاطر سب کچھ کرسکتے ہو، پر اسے روک نہیں سکتے، پھر اس سے بڑھ کر اور کون سا سودا ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی جانے والی رائیگاں شئے کو کسی کی خاطر دے کر مفت کا احسان بھی اس کے سر رکھ دیجیے۔

جاں بجاناں وہ وگرنہ از تو بستاند اجل

خود تو منصف باش اے دل ایں بکن یا آں بکن

لیکن جان دینے کی بھی بہت سی راہیں ہیں، تم ہتھیلیوں پر رکھ کر سامنے آؤ بتلاؤں کہ اس سب سے حقیر مگر سب سے زیادہ کام دینے والی جنس عجیب کے لٹانے کا اصلی طریقہ کیا ہے، پھر صرف یہ ہی راہ نہیں ہے کہ اپنے دشمن کی تلوار کے نیچے سروں کو کٹوادو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اپنے دوست کی تلوار کی نوک سے زخمی ہوجاؤ، زخم کھانا ہی ہے تو دوست ہی کے خنجر سے کیوں نہ تڑپیں، زہر کا جام پینا ہی ہے تو محبوب کے ہاتھوں سے کیوں نہ پئیں اور جان ہی دینی ہے تو کسی کے زانو پر سر رکھ کر کیوں نہ دیجیے؟

ومن الناس من یشری نفسه ابتغآء مرضات اللّٰه ،واللّٰه رؤفٌ بالعباد (بعض خدا کے محبوب بندے ایسے ہیں جو اپنی جان تک کو اللہ کی رضاجوئی کی راہ میں دے دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت محبت والفت رکھتا ہے۔)

افسوس! اس دورِ جوش وخروش و بیداری وہوشیاری میں بھی میں یہ دیکھتا ہوں تو میرے دل کی غمگینی اور اضطراب کا علاج کہیں نظر نہیں آتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یا تو غفلت کی سرشاریاں ہیں یا بیداری کی کروٹیں بھی لی ہیں تو آنکھوں سے غفلت دوشین کا خمار ابھی دور نہیں ہوا ہے، خواب غفلت کی سرشاری اور چشم نیم باز کی کروٹیں، یہ تو دو پہلی حالتیں ہیں لیکن ان کے بعد ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے جو بستر سے تو اٹھ چکا ہے مگر منزل مقصود کے نشان سے بے خبر ہے وہ چلنا بھی چاہتا ہے تو خطِ سفر سے نابلد ہے، احرام کعبہ کا باندھتا ہے۔ مگر قدموں کو حرم و بت کدہ کی تمیز نہیں ہوتی، حالاں کہ اگر منزل مقصود کے نشان کو ملنا ہے تو صرف کعبہ ہی راہ میں مل سکتا ہے اور وہ کئی نہیں بلکہ صرف ایک ہی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے کوئی انجمن قائم کرلی تو مصائب سے نجات پاجائیں گے بعض کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایک بڑا فنڈ مہیا کرلیا تو ہمارا وجود اسلام کے لیے اکسیر حیات بن جائے گا اس نے کبھی مدتوں ان امور کو سوچا ہے اس میں شک نہیں کہ ان تدبیروں میں سے ہر تدبیر اچھی اور ضروری ہے پر افسوس کہ مرض کا اصلی علاج نہیں ہے، تم اپنے سے باہر انجمنوں کو ڈھونڈھتے ہو مگر بدبختی یہ ہے کہ اپنے اندر کی خلوت سے بے خبر ہوگئے ہو، اسلام کی حفاظت کے لیے ایک فنڈ قائم کرنا چاہتے ہو تاکہ اپنی جیب اس کے حوالہ کردو لیکن اس سے بھی مقدم یہ ہے کہ اپنے دلوں کو اس کے سپرد کردو کہ اس کے بعد تم وہ سب کچھ دے سکو گے جو دینا چاہتے ہو، پر اس کے بغیر کوئی چیز بھی نہیں دے سکتے!

میں ایک صدائے مضطر اور ایک فریاد لرزاں ہوں، میری آواز کبھی نہیں تھک سکتی، کیونکہ میرا خدا اُسے تھکانا نہیں چاہتا اور میرے آنسو کبھی نہیں تھم سکتے، کیونکہ مدتوں کے جمع کیے ہوئے سیلابِ اشک کو اب بہنا ہے اور بہانا ہے، پس جس کے پاس کان ہیں وہ سن لے اور جس کے پاس آنکھیں ہیں وہ دیکھ لے اور جس کے پاس دل ہے وہ جتنا تڑپ سکتا ہے تڑپ لے، کہ آج خدا کے رُوٹھے ہوئے اور اس کے چاہنے والوں میں ہجر و وصال کا آخری معاملہ ہے، آج ہی کسی کا دامن

اقبال ہمیشہ کے لیے خالی ہونے والا ہے اور کسی کی آستین اب مالا مال ہونے والی ہے۔

آج ہی وہ شب موعود اور وہ لیلۃ القدر ہے جب کہ محروم ہونے والے محروم ہو جائیں گے اور منانے والے روٹھے ہوئے کو منالیں گے، وہ قوموں کی حیات وفنا کی فیصلہ کُن گھڑیاں جب کہ ایک کو دائمی مایوسی اور دوسرے کو ہمیشہ کی اُمید وشاد کامی ملے گی ایک کو دائمی ہجر کا عذاب الیم، مگر دوسرے کو ہمیشہ کی بشارت لطفِ صمیم کی تقسیم ہوگی بہت قریب ہے کہ ظاہر ہو جائیں وہ جس نے اب سے ہزاروں برس پہلے ایک ایسے ہی وقت میں سعیر کے دامن سے اپنا رشتہ کاٹا اور فاران کی چوٹیوں پر اپنا چہرہ دکھایا تھا، اب پھر وقت آ گیا ہے کہ اپنا چہرہ دکھلاتا ہے اور اپنے مشتاقوں کو ڈھونڈھتا ہے۔

اگر تم نہیں دیکھ سکتے تو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو تلاش کرو، میں دیکھتا ہوں اور مجھے مت جھٹلاؤ اگر تم نہیں سن سکتے تو میرے کانوں سے سنو پر مجھ سے گردن نہ موڑو کہ دنیا نے تم سے گردن موڑلی ہے۔ آہ! آہ! ثم آہ! علی ما فرطتم فی جنب اللہ اس کی صدائے لایزال ولم یزل آج اپنے چاہنے والوں سے کچھ کہہ رہی ہے فھل من مدکر اے لوگو! کہ تم نے میرے مقدس رشتہ عشق کی ...... تحقیر کی اور میری طرف سے گردن موڑلی! کیا تم بھُول گئے کہ تم دنیا میں بے نام ونشان تھے، پر میں نے اپنے نام کی عظمت کے ساتھ تمہارے نام کو بلند کیا، تم دنیا میں حقیر ومحتاج تھے، پر میں ہی قدوس ذوالجلال تھا کہ میں نے دنیا کی عظمتوں اور دینوی کبریائیوں کو تمہارے قدموں پر ڈال دیا تھا، تم گمراہ تھے پر میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا، تم فقیر تھے پر میں نے خشکیوں اور سمندروں کی حکمرانی تمہیں بخش دی، تم جہل وبے خبری کی تاریکی میں تھے پر میں نے تم کو پچھلوں کے علم وحکمت کا وارث اور آنے والوں کے لیے چراغ علم وہدایت بنایا، پھر تم کو کیا ہو گیا کہ تم نے مجھ کو چھوڑ دیا اور میرے دامنِ قدس کی تحقیر کی؟ وہ اور کونسا پیکرِ حُسن ودلربائی تھا جس کا حُسن میرے جمال جہاں آرا پر غالب آ گیا اور میرے حسن کی پرستش چھوڑ کر تم نے اس کی پائیگاہِ معشوقیت پر پیشانی رکھی؟ وہ میری کائناتِ

عالم میں میرے سوا اور کون تجلّی گاہِ حسن ورعنائی ہو سکتا ہے جو مجھ سے چھڑا کر تمہیں اپنا عاشق وشیدا بنا سکتا ہے؟ پھر بتلاؤ کہ مجھ سے کٹ کر تم نے کون سا نیا رشتہ کامرانی جوڑا اور مجھ کو چھوڑ کر کیا تھا جو تمہیں مل گیا، تم نے مجھ کو چھوڑا لیکن پھر کیا میری دنیا کی ہر قوت نے بھی تمہیں نہیں چھوڑ دیا؟ تم میرے آگے جھک کر پھر مغرور ہو گئے تم نے مجھ سے صلح نہ کی پھر کیا نہیں دیکھتے کہ آج تمام دنیا تم سے جنگ کر رہی ہے؟ جب تم میرے آگے نہیں جھکے تو بتلاؤ کہ میری دنیا کو اپنے آگے جھکانے کے کیوں آرزومند ہو؟ جب تم مجھ سے پھر گئے تو بتلاؤ کہ میری دنیا تم سے کیوں نہ پھر جائے؟

اے نادانو! اب بھی مان جاؤ کہ میرا دروازۂ رحمت وبخشش تو کبھی بند نہیں ہوا ہے، اب بھی مجھ سے صلح کر لو کہ مجھ سے جنگ جاری رکھ کر تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، دنیا کا ہر دروازہ تم پر بند ہو سکتا ہے۔ مگر میرا ہی ایک دروازہ ہے جو صرف کھلنے کے لیے ہے، بند ہونے کے لیے نہیں ہے! تم ہزاروں مرتبہ اس دروازہ سے بھاگو، پھر بھی وہ تمہاری آمد کا منتظر ہے

باز آ! بہر انچہ کردی باز آ
گر کا فر وگبر وبت پرستی، باز آ
ایں درگہ باورکہ نو میدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی، باز آ

یا عبادی الذین اسرفو اعلی انفسھم لا تقنطو امن رحمۃ اللّٰھط ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا ط انہُ ھو الغفور رحیم

(اے میرے بندو! کہ تم نے میری نافرمانیاں کر کے طرح طرح کے ظلم خود اپنی جان اور اپنی زندگی پر کیے ہیں، گو وہ کتنے ہی سخت اور غضب انگیز ہوں تاہم اپنے رب کی رحمت ورافت سے مایوس نہ ہو، توبہ کرو اور اس کے آگے جھک جاؤ وہ تمہارے تمام قصوروں کو معاف کر دے گا، وہ تو بہت

ہی بڑا بخش دینے والا مہربان ہے!)

اے عزیزانِ ملت! میں کیوں کر تمہیں اپنے دل کے خونچکاں ٹکڑے دکھلاؤں، جس کے ہر ٹکڑے میں زخموں اور ناسوروں کے ہزاروں نشان ہیں اور پھر میں کیوں کر اپنا دل تمہارے پہلو میں رکھ دوں کہ تم اس صدائے الٰہی کو نہیں سنتے، پر میں سنتا ہوں اور کانٹوں پر لوٹتا ہوں، اور آگ کے شعلوں میں تڑپتا ہوں، تم میری آواز نہیں سنتے ہو، اس سوزش و اضطراب کے آتشکدہ کو تم نہیں دیکھ سکتے جو میرے اندر سلگ رہا ہے اور جس کے شعلے اب اس قدر بھڑک اُٹھے ہیں کہ میں ان کے دھوئیں کو نہیں دبا سکتا، میں راتوں کو بستر پر لیٹتا ہوں اور دن کو کاموں میں سرگرم رہتا ہوں لیکن مجھ کو میرا گمشدہ دل نہیں ملتا اور میرے کان میرے قبضہ میں نہیں رہتے۔

آج کل کی راتوں میں، جب کہ ایک، عالم خواب نوشیں کی راحت فرمائیوں میں مست و بے خبر ہوتا ہے، جب کہ ابتدائی نصف رات کی چہل پہل ختم ہو جاتی ہے اور پچھلے پہر کا مقدس اور لا ہوتی وقت شروع ہوتا ہے تو میں اس وقت اپنے غمکدہ کے ایک کنجِ باغ کی سنسان اور فکر پرور تنہائی میں عیشِ خواب سے مہجور اور راحتِ بالش و بستر سے محروم پڑا ہوتا ہوں، پھر تم یقین کرو کہ میں اس کو دیکھتا ہوں جس کی روشنی بجلی کی طرح شعلہ آسا لیکن بجلی کی طرح نظروں کو خیرہ کرنے والی نہیں ہوتی، میرے کانوں میں ایک صدائے سامعہ نواز و نغمہ آسا آتی ہے جو دریاؤں کی آہستہ روانی سے مشابہ یا کسی دور کی صدائے ارغنوں کے مانند ہوتی ہے۔

میں ایک پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جس کی نسبت نہیں کہہ سکتا کہ وہ اوپر ہے، پر مجھے خیال ہوتا ہے کہ اوپر ہے، جب کہ وہ کہتا ہے: هل من تائب ناتوب عليه هل من فاعطيه يا طالب الخير! قبل و یاطالب اشرا اقصر! (آج کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ میں اس کی توبہ قبول کروں، کوئی طالبِ مغفرت ہے کہ میں اسے بخش دوں کوئی مجھ سے مانگنے والا ہے کہ میں اُسے عطا

کروں، ہاں کوئی ہر طرف سے کٹ کر میری طرف آنے والا ہے کہ میں اُسے آغوش میں لے لوں، کوئی میرے آگے تڑپنے والا ہے کہ میں اُسے تسکین دوں، کوئی میرے آگے خاکِ اضطراب و انابت پر لوٹنے والا ہے کہ میں اُسے اپنی گود میں اٹھا لوں؟ یعنی کوئی ہے کہ میرا بن جانے والا ہو اور میں بھی اس کا ہو جاؤں، کوئی مجھے پیار کرنے والا ہے کہ میں بھی اُسے پیار کروں؟ پھر وہ کہاں ہیں جو مجھے ڈھونڈھنے والے ہیں اور وہ کیوں نہیں.. دوڑتے جو میرے لیے تشنہ ہیں؟ میں اُن کے لیے جو کہ پیاسے ہیں پانی ہوں اور ان کے لیے جو مایوسی سے تھک گئے ہیں، اُمید ہوں، اگر تم زخمی ہو تو میری طرف آؤ کہ میں مرہم ہوں اور اگر تم بیمار ہو تو مجھ کو ڈھونڈھو کہ صرف میں ہی شفا ہوں، تم کیوں غیروں کی ٹھوکریں کھاتے ہو اور میری آغوش محبت سے بھاگتے ہو، حالاں کہ میں تو وہ ہوں کہ اگر تم ایک بالشت میری طرف بڑھو تو میں ایک ہاتھ آگے بڑھ کر تمہارا استقبال کروں، اگر تم چل کر میری طرف آؤ تو میں دوڑ کر تمہاری طرف آؤں۔ اگر تم میرے ملنے کو محبوب رکھو گے تو یاد رکھو، میں بھی تم سے ملنے کو محبوب رکھوں گا اور اگر تم مجھ سے پھر جاؤ گے تو میں بھی تم سے پھر جاؤں گا، اے طالبِ خیر! تو کہاں ہے کہ میں تجھے پکار رہا ہوں، جلدی کر، جلدی کر، یہی مانگنے کا وقت ہے اور صرف یہی وقت ہے کہ میں تم کو بچا لوں)

پس اے اخوانِ عزیز! اس آواز کو سنو اور اگر نہیں سنتے تو میری ترجمانی کو مت جھٹلاؤ کہ میں سو رہا تھا کہ اس نے مجھے نیند سے جگا دیا، ایسا نہ ہو کہ غفلت سے چونک کر بھی غفلت میں رہو، اور بستر سے اُٹھو بھی تو بستر کی جگہ راہ میں سو جاؤ اس شخص کی غفلت میں جو بستر پر پڑا ہو اور اس میں جو ہوشیاروں کی طرح چل کر غلط راستوں میں پھنس کر رہ گیا ہو، کوئی فرق نہیں ہے، یہ تمہارا آجکل کا اضطراب مبارک ہے، یہ تمہاری جستجوئے مقصود ایک رحمت الٰہی ہے یہ تمہاری آمادگی اور مستعدی اُمید کا فرشتہ ہے اور ہمت کا پیغام ہے، مگر میری سنو اور اللہ کی پکار کی طرف سے غفلت نہ کرو، اگر سنبھلنا

چاہتے ہوتو ایک ہی وسیلہ یہ ہے کہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرو اور احکام الٰہی کے اعتقاد و عمل کا عہد واثق کر کے اُٹھ کھڑے ہو، توبہ کرو کہ تمہارے تمام دکھ کی دوا صرف توبہ ہی ہے، خدا کے آگے جھکو اور اسی کو پیار کرو، اس کو اپنے سے مناؤ کہ جب تک دوست کو اپنے سے راضی نہ کرلو گے خواہ کتنی ہی محنت و مشقت کرو لیکن کبھی مقبول نہ ہوگی۔

میں چپ تھا پر اب اٹھا ہوں کہ جو سن رہا ہوں تم کو بھی سناؤں آؤ کہ ہم سب مل کر اس کے دروازہ پر جُھکیں اور ایک مخلص و مجاہد جماعت بن کر صرف اسی کے ہو جائیں، اسی کی دعوت ہے جس کی طرف بلاتا ہوں پس مبارک ہیں وہ جو میری سنیں اور خدا کی طرف بڑھیں کہ بالآخر کامیابی انہیں کے لیے ہے۔

آستانہ دہلی جنوری ۱۹۶۵ء

☆☆☆

اصلاح عالم کے لیے جہاد

اسلام ہر ظلم اور بُرائی کے خلاف صف آرا ہو گیا

اللہ کی صداقت اور عدل کی راہ میں تکالیف اور صعوبتیں برداشت کرنا، حق و صداقت کی راہ میں انتہائی سعی و کوشش کرنا، اور ایثار و قربانی سے کام لینا ''جہاد مقدس واقدس'' ہے۔ ''جہاد'' جَہد سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں، سعی و کوشش، اور کسی نیک کام کے لیے صعوبتیں اُٹھانا، خواہ یہ کوشش ملک و وطن کے لیے ہو یا قوم کے لیے زمین کے کسی خاص حصہ کی بھلائی کے لیے ہو یا تمام دنیا کی بھلائی کے لیے، ہر حالت میں یہ جہاد ہے، اور جس بخت بیدار کو اس کی توفیق ملے وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

''جہاد'' ۔ایک لفظ عام ہے، خود قرآنِ کریم نے ''جہاد'' و ''قتال'' کے فرق کو بار بار نمایاں کیا ہے، ہر وہ سعی و کوشش، ہر وہ انتہائی جہد ہر راہ عمل کی سختی کی برداشت جو حق کے لیے ہو، صداقت و حقیقت کی خاطر ہو، نیکی کے قیام اور بدیوں کے استیصال کی راہ میں ہو جو اللہ کی مرضی کے تابع اور شیطان کی آرزوؤں کے مخالف ہو، دراصل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اس راہ میں پتھر کھائے اور کفر و عصیاں سے بندگانِ الٰہی کو روکا، یہ اصلاح اعتقادات اور اعمال دینیہ کا جہاد تھا، حضرت ابراہیم نے کالڈیا کے صنم کدوں سے ارض الٰہی کو پاک کیا اور ستارہ پرستوں کو دعوت توحید دی۔ اس کے جواب میں مخالفین نے اُن کے جلانے کے لیے آگ سلگائی اور اُن کی ہلاکت کے درپے ہوئے۔ یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون مصر کی شخصی حکومت اور جابرانہ غلامی کے قلع قمع کے لیے اُٹھے اور اپنی قوم کو

غیروں کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی یہ ایک پولیٹیکل جہاد تھا، مگر یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا۔

حضرت مسیح بنی اسرائیل کے گمشدہ اخلاق کے سراغ میں آئے ظالم یہودیوں نے اُن کے منہ پر تھوکا پلاطوس کے بے رحم سپاہیوں نے اُن کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا تا کہ وہ صلیب پر چڑھائے جائیں۔ یہ ایک اخلاقی جہاد تھا۔ چناں چہ اس اخلاقی مجاہد نے اس راہ میں اپنی عظیم الشان قربانی دے کر منشائے الٰہی کو پورا کر دیا۔ بس یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا۔

حضرت خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کو دور کرنا چاہا اور اپنی جماعت مقدس کی زندگی اس راہ میں وقف کر دی۔ یہ دعوت کسی خاص قوم اور زمین کے کسی حصہ کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ اُن کی دعوت عام اور عالمگیر تھی یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا، اس راہ میں اس مقدس ہستی نے زخم کھائے، صعوبتیں برداشت کیں، وطن عزیز کو خیر باد کہا، اپنے ساتھیوں کی قربانیاں دیں، تب کہیں دنیا کو ضلالت اور تاریکی سے نجات ملی۔

جہاد فی سبیل اللہ کے وسائل اور ذرائع نہایت وسیع ہیں ان کو صرف تلوار کے قبضہ کے اندر محدود سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے، ''جہاد'' راہِ حق میں ایک سعی و کوشش ہے خواہ وہ زبان سے ہو خواہ مال سے، خواہ تلوار سے خدا کی سچائی اور انسانی ظلم کے انسداد کی راہ میں اپنے قویٰ کا صرف کرنا خواہ کسی صورت اور کسی شکل میں بھی کیوں نہ ہو، ''جہاد'' ہے، قرآن میں ہر جگہ ''جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔'' آیا ہے یعنی جہاد اپنے نفوس اور اپنے اموال کے ذریعہ کرو، نفوس کے جہاد میں ہر طرح کا ذریعہ جہاد آ گیا، امام احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے، ''جہاد کرو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اور اپنی زبان سے،'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد نہ صرف جان و مال سے بلکہ زبان سے بھی ہوتا ہے، فی الحقیقت، ''جہاد لسانی'' اشرف ترین جہاد ہے، جو انبیائے کرام کا معمول رہا ہے جہاد لسانی تمام مجاہدات کی بنیاد اور وسیلہ بنا رہا ہے۔

تم اپنے نفس شیطان کے لیے اُٹھو یا موسیٰ کی طرح دشمن کو شکست دینا چاہو یا مسیح کی طرح دشمن سے شکست کھا کر فتح حاصل کرنا چاہو، غرض کہ کسی قسم کے جہاد کے لیے مستعد ہو، مگر سب سے پہلے تمہیں اُن جادو اثر زبانوں ہی کی تلاش ہوگی جو جہاد لسانی کے ذریعہ بندگانِ الٰہی کی غفلت دور کریں، اُن کو خدا کا پیغام پہنچائیں، اُن کو تفکر و تدبر کی دعوت دیں، اُن کو غفلت و اعراض کے نتائج سے ڈرائیں اور بالآخر خدا کی بخشی ہوئی طاقت گویائی سے ایسی جاں فروش جماعتیں پیدا کر دیں جو حق و صداقت کے عشق سے مضطرب اور جہاد فی سبیل اللہ کے جوش سے دیوانہ ہو جائیں۔

دنیا میں اصلاح کے بیج نے ہمیشہ سب سے پہلے ''جہاد لسانی'' ہی کا پودا پیدا کیا ہے، اور یہی پہلی اینٹ ہے جس پر بڑی بڑی عمارتیں بنی ہیں، اور بڑے بڑے شہر بنائے گئے ہیں، تمام انبیائے کرام جو اصلاح کی دعوت لے کر آئے انھوں نے اپنے الٰہی کاروبار کو زبان ہی سے شروع کیا۔

حضرت نوح نے پتھروں کی بارش میں وعظ کہا، خلیل اللہ نے کالڈیا کے بُت خانے کے پُجاریوں کے سامنے تقریر کی بنی اسرائیل کے نجات دہندہ موسیٰ کو بھی اپنا کام اسی سے شروع کرنا پڑا، اُنھوں نے فرعون کے تخت کے آگے اور فرعونیوں کے مجمع کے سامنے دونوں ہی جگہ وعظ ہی کے حربہ الٰہی سے کام لیا اور وہ آفتاب کنعانی جس سے مصر کے قید خانہ میں اُجالا ہوا اُس نے بھی زندان مصائب میں وعظ ہی کہا۔ پھر وہ جو ناصرہ میں پیدا ہوا اور جس نے گلیل کی گلیوں سے اپنی مقدس منادی شروع کی اُس نے بھی اپنا کام وعظ ہی سے شروع کیا اور وعظ ہی پر ختم کیا۔

پھر سب سے آخر، اسلام کی تحریک الٰہی جس نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، اُس کی ابتدائی تاریخ بھی وعظ ہی سے شروع ہوئی اور وعظ ہی پر ختم ہوئی وہ اصلاح انسانیت کا آخری ظہور اکبر جس نے موسیٰ کی طرح حملہ نہیں کیا، اور مسیح سے زیادہ عرصہ تک مصائب پر صبر کیا، گو بدر کے

کنارے اور اُحد کے دامن میں تلوار کا جواب تلوار سے دینے پر مجبور ہوا، تاہم اُس کا اصلی حربہ ''لسانی جہاد'' ہی تھا، اُس نے تورات کے حامل کی طرح قتال خونین نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ جہاد لسانی ہی کو ہر جہاد پر مقدم رکھا، نوح کی طرح اُس پر پتھر پھینکے گئے پر اُس نے نوح کی طرح بد دُعا کرتے ہوئے یہ نہیں کہا، ''اے پروردگار ان کافروں میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑ کہ یہ رُوئے زمین پر زندہ نظر آئیں''، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ ''خدایا میری قوم کو ہدایت کر کیوں کہ وہ نہیں جانتے'' خدا نے اُس کی آواز سنی، اُس کی دُعا قبول کی، اور جب یہ قوم اصلاح کے لیے میدان میں آئی تو اس نے بدی کو کرۂ ارض سے مٹا ڈالا، شیطان لعین کا تخت اُلٹ دیا اور نئے سرے سے حکومت الٰہیہ قائم ہوئی جس میں ہر مظلوم کے زخموں پر مرہم رکھا گیا اور ہر گمراہ کو سیدھا راستہ دکھایا گیا، اور اُس نے اپنے متبعین کو ہدایت کی کہ بجز حالت مجبوری کبھی تلوار نہ اُٹھاؤ، جس خطہ ارضی میں بھی جاؤ ''لسانی جہاد'' سے کام لے کر بُرائیاں دُور کرو، چناں چہ یہی ہوتا رہا اور اس لسانی جہاد کی بدولت وہی دنیا جو ضلالت اور تاریکی میں پڑی ہوئی تھی حق وصداقت کے نور سے معمور ہوگئی۔

دین دنیا دہلی   اکتوبر ۱۹۵۵ء

☆☆☆

مسلمان دنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں

بشرطیکہ اپنے دلوں کو خدائی طاقت کا مرکز بنالیں

حجاز کی ایک جماعت قلیل جس کو نہ ساز و سامان دینوی حاصل تھا اور نہ جس کے قبضہ میں دنیاوی ریاست وعظمت تھی۔ نہ اُس کے پاس آلاتِ جنگ تھے۔ نہ کوئی مسلح فوج راہِ حق میں نکل کھڑی ہوئی یہ وہ چند فقرا اور صالحین کی جماعت تھی جنھوں نے دعوت الٰہی کا ساتھ دیا۔ اللہ کی پکار کو سن کر اُس کی تلاش میں نکلے۔ ان پاکباز بندوں نے آسمان کے لیے زمین والوں سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔

ان کے پاس پُر ہیبت جسم نہ تھے۔ اور نہ خونخوار اسلحہ۔ مگر ان کے سینوں میں صداقت شعار دل تھے اور ان کی آنکھوں میں سچائی کے آنسو۔ انھوں نے تعلیم الٰہی کو اپنا دستور العمل بنایا۔ انھوں نے ہر اُس لفظ کو جو خدا کے محبوب پیغامبر کی زبان سے نکلا اپنے اعمال اور افعال کے اندر محفوظ کر لیا۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر ان کے اعمال گویا تھے۔ انھوں نے اُس ''اُسوہ حسنہ'' کی زندگی کو اپنا نصب العین بنالیا جو گو انسان تھا مگر اپنے ہر فعل کے اندر ایک خدا نما جلوہ الٰہی رکھتا تھا وہ نہ صرف کتابی تعلیم بلکہ ایک عملی نمونہ لے کر دنیا میں بڑھے۔ اور آسمان کی بادشاہت کا وہ مقدس تخم جس کی منادی شام کے مرغزاروں میں ہوئی تھی۔ حجاز کے ریگستانوں میں نشوونما پانے لگی۔ تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ ایک سر سبز وتناور درخت نے اپنی ڈالیوں سے کرۂ ارضی کو چھپا لیا۔ پرندوں نے اُس کی شاخوں میں نشیمن بنائے اور زمین کی تباہ حال مخلوق نے اُس کے سائے میں پناہ لی۔

یاد رکھو وہ خدا جو مکان و زمان سے منزہ ہے جب دنیا میں آتا ہے تو اپنے بسنے کے لیے گھر

چاہتا ہے۔ زمین کی شاندار آبادیاں۔ پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں، سمندر کی ناپیدار کنار موجیں، صحراؤں کے وسیع میدان، یہ سب اُس کے لیے بیکار ہیں۔ اُس کے بسنے کے لیے چاندی اور سونے کے محل، اور صندل و آبنوس کا تخت مطلوب نہیں ہے جس میں لعل والماس کے ٹکڑے جڑے ہوں، وہ اُن دلوں کا طالب ہے جن میں اُس کے دردِ محبت کے زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں، اُس کے لیے فقیروں اور خاک نشینوں کی ایک جماعت چاہیے، جن کے دل ٹوٹے ہوئے جن کے جگر جلے ہوئے اور جن کی آنکھیں خونبار ہوں۔ یہی ٹوٹے ہوئے کھنڈر اُس کے رہنے کے لیے ایوان و محل ہیں۔ اور یہی اُجڑی ہوئی بستیاں ہیں جن کو اُس نے اپنی آبادی کے لیے چُن لیا۔ پس اُس قدوس وقدیم کا دنیا میں کوئی گھر ہوسکتا ہے تو وہ صرف اُن انسانوں کے دلوں ہی کا آشیانہ محبت ہے جنہوں نے اس گھر کو اس کے بسنے کے لیے پہلے ہی سے سنوار رکھا ہے۔ اور اُس کی آرائش و تزین سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ پس اگر تم اُس کے طالب ہو تو ایک جماعت پیدا کرو تا کہ وہ اُس کے جمال اور قدوسیت کا آشیانہ بنے۔ ایسا آشیانہ جو دلوں کی دنیا میں انقلاب پیدا کردے۔ جو رُوح کو گرما دے۔ مگر یہ انقلاب پیدا کرنا آسان نہیں۔

دنیا میں مادی انقلابات ہمیشہ سلطنتوں کے تغیرات اور خوں ریز جنگوں کے ظہور سے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن غور کرو کہ ان میں کا ہر چھوٹے سے چھوٹا انقلاب بھی کیسی گرانقدر قیمت رکھتا ہے۔ قرنوں کی قرنیں فکر وتدبیریں گذر جاتی ہیں۔ خزانوں کے خزانے لٹا دیے جاتے ہیں۔ پھر فوجوں کے سمندر طوفان میں آتے ہیں۔ قیمتی سے قیمتی آلات اور اسلحہ کروڑوں کی تعداد میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بے شمار انسانوں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ اور خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ عورتیں بیوہ بچے یتیم اور والدین زندہ درگور ہوجاتے ہیں۔ جب کہیں جا کر ایک چھوٹا سا انقلاب تکمیل کو پہنچتا ہے۔

جب دنیا کے ان مادی انقلابات کا یہ حال ہے تو پھر اُس روحانی اور قلبی انقلاب کو سوچو جو زمین کی سطح اور انسان کے جسموں کو نہیں بلکہ رُوحوں اور دلوں کی اقلیموں کو پلٹ دینا چاہتا ہے۔ اور کروڑوں انسانوں کے اعمال و خصائل کے اندر تبدیلی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ان انقلابات کے لیے کیا محض انسانی قوت و تدبیر اور محض اخلاق و مذہب کے چند رسمی اُصولوں کو پُکار دینا ہی کافی ہوسکتا ہے۔ تم ایک مرتبہ خود اپنے ہی نفس کو آزما کر دیکھو جس پر تم کو پوری قدرت حاصل ہے کیا ایک چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی اپنے نفس و اعمال کے اندر تم بآسانی پیدا کرسکتے ہو؟ پھر جب تم ایک نفس کی تبدیلی پر جو خود تمہارے اختیار میں ہے قادر نہیں تو کروڑوں دلوں کو کیوں کر بدل سکتے ہو۔

اصل یہ ہے کہ انسان جسم کو پارہ پارہ کرسکتا ہے مگر دلوں کو مشکل ہی سے بدل سکتا ہے البتہ اگر تم اپنے اندر قوت الٰہی پیدا کرلو۔ اگر اپنی جماعت کے اندر اُس کارفرمائے حقیقی کا گھر بنالو۔ تمہاری صداؤں کی جگہ تمہارے اندر سے اُس کی آواز نکلنے لگے۔ تمہاری آنکھوں کے حلقوں سے تمہاری نظروں کی جگہ اُس کی نگاہیں کام کرنے لگیں تمہارے اعمال و افعال یکسر اُس کی صفات و افعال ہوجائیں۔ یعنی از فرق تا بقدم اپنے تمام اعمال و خصائل میں تم ایک پیکر اخلاق الٰہی بن جاؤ تو پھر تمہارے کام خود تمہارے کام نہ ہوں گے۔ جن کے لیے انتظار، حسرت، اور ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے بلکہ یکسر اُس قادر مقتدر کے کاروبار ہوں گے۔

پھر جب وہ جو سب کا مالک ہے، ''تم میں ہوگا''، تو تم کو بھی اس کے ملک کی ہر شے پر قدرت حاصل ہوجائے گی۔ کیوں کہ تمہاری قدرت درحقیقت اُسی کی قدرت ہوگی۔ تمہاری صدائے دعوت ایک سیلاب انقلاب ہوگی جس کو دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکے گی، تمہاری زبانوں سے جو کچھ نکلے گا وہ دلوں اور رُوحوں پر نقش ہوجائے گا اور پھر نہ زمین کا پانی اُسے دھو سکے گا اور نہ آسمان کی بارش اُسے محو کرسکے گی، تمہاری تعلیم کامرانی کے پھول اور پھل دونوں اپنے ساتھ لائے گی۔ تمہاری

آنکھوں سے شعلۂ الٰہی کے جب شرارے نکلیں گے، تو دنیا میں کس کی آنکھ ہوگی جو تم سے دوچار ہو سکے گی، تمہاری زبانوں سے جب لسانِ الٰہی کی صدا بلند ہوگی تو خدا کی آواز کو سن کر اس کی کون مخلوق ہوگی جو لبیک نہ کہے گی۔ تم جس طرف سَر اُٹھاؤ گے دلوں کو سربسجود اور رُوحوں کو معرفِ عجز و نیاز پاؤ گے اور خدا کا قاہر و مقتدر ہاتھ تم میں سے ظاہر ہو کر ملکوں اور قوموں کو منقلب کر دے گا۔

تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ کیا بوالعجبی ہے کہ پاک تعلیمات کا اثر اور مقدس صداؤں کی تاثیر ہم میں سے مفقود ہو گئی ہے؟ اس کا کیا سبب ہے کہ پاک سے پاک ارادے ہمارے ذہنوں میں مقید ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات ہماری فکروں میں محبوس ہیں، اور پاک سے پاک تعلیمات صرف ہماری زبانوں پر ہیں مگر نہ تو ارادوں میں قبولیت ہے۔ نہ خیالات میں فعالیت اور نہ تعلیمات میں اثر۔ کبھی جس دنیا کے وسیع ٹکڑوں کو صرف زبان کی ایک جنبش نے مضطرو سیماب وار کر دیا تھا۔ آج اُسی دنیا میں بڑی سے بڑی جماعتوں کی صدہا صدائیں ایک نفس واحد کی غفلت میں بھی حرکت پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہی اسلام کی صدائے دعوت تھی، جس کے ذریعہ ایک ایک داعی ایک ایک اقلیم کو مسخر کر لیا تھا، مگر آج یہی دعوت خود اپنے ہی دلوں میں تپش اور گرمی نہیں پیدا کرتی۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا کا سر ہمیشہ صدائے عمل کے آگے جُھکا ہے نہ کہ صدائے قول کے سامنے، جب تک مصلح اپنے اندر اپنی اصلاح کا نمونہ نہیں رکھے گا، اس کی تعلیم دلوں کی قبولیت اور روحوں کی اطاعت سے محروم رہے گی۔ آگ جب جلتی ہے تو سب سے پہلے جلانے والے کو گرم کرتی ہے۔ اگر تمہارے پاس آگ ہے تو سب سے پہلے اس آگ سے اپنے آپ کو گرماؤ۔ اسلام نے ایک جماعت صحابہ کرام کی پیدا کر دی تھی جو اس تعلیم کا صحیح ترین نمونہ اپنے اندر رکھتی تھی اور اُن میں کا ہر فرد اس اُسوۂ حسنہ کی قوت سے ایک ایک اقلیم کی تسخیر اپنے قبضہ اقتدار میں رکھتا تھا ان کے اعمال کے اندر

تعلیمات الٰہیہ کی مقدس انگیٹھی شعلہ زن تھی اس لیے وہ جہاں جاتے تھے ایک آتش کدہ اثر اپنے ساتھ لے جاتے تھے، آج بھی ان کا نمونہ ہمارے سامنے ہے، اگر آج ہم ان کے نقش قدم پر چلنے لگیں تو پھر ایک بار دنیا کا نقشہ بدل دیں۔

دین دنیا دہلی جنوری ۱۹۵۴ء

☆☆☆

مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل

اسلام کی ابتداء غربت سے ہوئی تھی۔ اور اُسے غربت میں دوبارہ مبتلا ہونے کے خبر دی گئی ہے۔ بَدَاءَ لِاسْلَامُ غَرِیْبًا وَّ سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا، اور آج پھر اسلام پر غربت اولیٰ کا سا عالم چھا گیا ہے۔ پس وہی مومنین مخلصین اس کے سچے خادم ہوسکتے ہیں جو اس کے عہد ابتدائی کے خادموں اور جانثاروں کی طرح اپنے جان و مال کو اُس پر نثار کردیں گے۔ آج اگر ہر طرف ابولہب اور ابوجہل کی ذریت نے دنیا کے بہت سے حصوں کا احاطہ کرلیا ہے تو ضرورت ہے کہ مہاجرینؓ مکہ اور انصارؓ مدینہ کے متبعین صادقین بھی ہر طرف بیدار ہوجائیں، اگر دشمنوں نے دوبارہ حملہ کیا ہے تو دوستوں کو بھی دوبارہ نکلنا چاہیے۔ آج ہمیں نہ محض مامون الرشید کا بیت الحکمت فائدہ دے سکتا ہے، نہ صرف صلاح الدین ایوبی کی تلوار اور نہ ابن سبکتگین کا خزانہ! کیوں کہ یہ درمیانی عہد کی کڑیاں تھیں اور اب ہم پھر اپنی ابتدائی غربت کی طرف ہٹ آئے ہیں ہم کو اُن سب کی جگہ ذِھَابِ اِلَیَ اللّٰہِ۔ کا وہ ولولہ چاہیے جو جعفرؓ طیار نے حبشہ پہونچ کر دکھلایا۔ ہم کو وہ خلوص و جاں نثاری چاہیے جو غارِ ثور میں صدیق اکبرؓ نے دکھلائی اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ ہم کو وہ جوش انفاق فی سبیل اللہ چاہیے۔ جو ہجرت مدینہ کے دن انصارِؓ مدینہ نے دکھلائی اور اپنے مہاجرؓ بھائیوں کو اپنا گھر بار سونپ دیا۔ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ۔ ہم کو وہ جذبہ جہاد اور مشق قتال فی سبیل اللہ درکار ہے جس کی لسان الٰہی نے مدحت سرائی کی۔ یُجَاھِدُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ ہم کو وہ بھائیوں کی سی برادری اور سپاہیوں کی سی فوج چاہیے جس کی نسبت وحی الٰہی پکار اُٹھی تھی، اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ، ہمارے دُکھ کی دوا انصارؓ مدینہ کی اُن عورتوں کے پاس ہے جو

اپنے سات سات عزیزوں کی موت کی خبر سنتی تھی۔ مگر محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کا مژدہ اُن کی آنکھوں کو اشکبار ہونے کی جگہ خوشی سے چمکا دیتا تھا۔ ہم مردوں کو اُن جاں فروش حجلہ نشینوں کے آگے گرنا چاہیے جو اپنے سینوں کو تیروں کی بارش سے چھلنی کردیتی تھیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کے سامنے سے نہیں ہٹتی تھیں، کہ مبادا دشمنوں کا نشانہ اُس وجود مقدس کو صدمہ نہ پہنچادے جس کے قیام سے تمام کرۂ ارض کی سعادت کا قیام ہے۔

من و دل گرفنا شدیم چہ باک
غرض اندر جہاں سلامتِ اوست!

ہمارے اسلاف کرام میں بڑے بڑے فاتح، بڑے بڑے سلاطین اور بڑے بڑے مالک خزائن و اموال گزرے ہیں۔ مگر اب ہماری زندگی بغداد کے دارالخلافہ اور دہلی کے تخت عظمت وجلال کی یاد میں نہیں ہے بلکہ مدینہ کی خس پوش مسجد کے فقراءِ وصعالیک کی یاد کے اندر ہے۔ اللہ اکبر حیاتِ فقراءِ مقدسین کہ ان کا واسطہ دے کر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم حضرتِ الٰہی میں دعائے فتح مانگتے تھے۔ کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یستفتح بصعالیك المهاجرین۔

زمانہ جن کاموں میں مبتلا ہے اور کام کرنے والی قوتیں جن راہوں میں بھٹک رہی ہیں، وہ ہمیں کچھ بھی نفع نہیں پہونچا سکتیں، لوگوں نے نہ تو منزل مقصود کو پایا ہے اور نہ اُس کی راہ ہی پہچانی ہے۔ مکان معلوم ہو تو راہ میں بھٹک جانے کا کوئی غم نہیں، کیوں کہ کبھی نہ کبھی ٹھیک راہ پر لگ ہی جائیں گے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اپنے گھر ہی کو بھول بیٹھے ہیں پھر راہ خواہ کتنی ہی پُر فضاء اور خوشنما ہو، مگر جس قدر چلتے رہیں گے منزل سے دور ہی ہوتے جائیں گے۔ کیوں کہ وہ راہ اچھی ہے مگر منزل فراموش کردی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی عالیشان محل کے دروازہ پر پہونچ جائیں۔ مگر اس طرح چل کر ہمیں ہمارا گم شدہ جھونپڑا تو نہیں مل سکتا!

بہر حال آج جو کام مختلف شاخوں میں ہو رہے ہیں۔ اُنہیں ہونے دو لیکن خدمت دین وملت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے عزائم کو بلند کرو، اپنی نظروں کو سامنے سے ہٹا کر اوپر کرو، اپنا قبلۂ رُخ سامنے کے مناظر کو نہیں، بلکہ عقب کی چھُٹی ہوئی منزلوں کو بناؤ! خواہ وہ مسئلہ مال ومتاع ہو، یا مسئلہ جان ودل۔ خواہ وہ کاموں کا آغاز ہو یا ارادوں کا اتمام! اور خواہ وہ امن کی تیاری ہو یا جنگ کی پُکار اپنے تمام کاموں میں صحابہ کرامؓ اور سلفِ صالحینؒ کی پیروی واتباع کامل پیدا کرو، خدا تمہاری مدد کرے گا۔

آستانہ دہلی اکتوبر ۱۹۵۷ء

☆☆☆

العصر

فلسفہ تشکیکیہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عالم میں ہزاروں چیزیں مرئی اور غیر مرئی، محسوس اور غیر محسوس ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن اُن کی حقیقت وماہیت ہم سے مخفی ہے۔ ہم تجربہ، اختیار، استقراء اور دلائل سے اصلیت اور واقعیت کے چہرہ سے پردہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور آخر چند نتائج تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔

ہم میں بعض محتاط اس بنا پر کہ اس سے پہلے بھی ہم سینکڑوں نتائج تک پہنچے، لیکن وہ واقعی نہ تھے نیز ہمارے قوائے فکر وعمل اس قدر کمزور ہیں کہ تحقیق واقعیت اور اثبات حقیقت کا بار گراں نہیں اُٹھا سکتے، اور حقائق وماہیات اشیائے عالم اس درجہ خفی وتاریک ہیں، کہ موجودہ آلاتِ فکر ونظر اُس کو روشن نہیں کر سکتے، ہمارے ہر نتیجہ کو حقیقت سے عاری اور واقعیت سے معطل قرار دیتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ خود اس کے انکار کی جرأت کرتے ہیں کہ عالم میں کوئی حقیقت ہے، ان کی نظر میں ہر شئے تخیل اور دماغ کا اختراع ہے۔

دوسرا گروہ اُس کے بالمقابل ہے جو مدعیانہ کہتا ہے کہ عالم حقائق سے معمور، ہمارے تجارب واختیارات ودلائل صحیح اور ہمارے نتائج واستنباطات قطعی ہیں۔ اشیاء حقائق واقعیہ ہیں، اور برہان وتجربہ نے جن نتائج تک پہنچایا ہے، وہ اس وقت تک یقینی ہیں جب تک اُن کے خلاف کوئی دلیل صحیح نہ ہو۔

ایک معتدل گروہ آگے بڑھتا ہے اور فریق اول کو مخاطب کرتا ہے، دوستو! جب تم آلاتِ

فکرکو ناکافی، دلائل کو غیر موصل الی المطلوب اور عالم کو حقائق سے عاری یقین کرتے ہو تو تم کیوں کر کہتے ہو کہ ہم کسی شئے میں کوئی حقیقت نہیں پاتے؟ کیا ابھی تم نے جن خیالات کو ظاہر کیا کہ ہمارے آلات عمل و فکر ناکافی ہیں، دلائل غیر موصل الی المطلوب ہیں اور عالم حقائق سے عاری ہے، کیا تم خود ان کی صحت کا یقین کر کے اِن اصول کی حقیقت کے قائل نہیں ہو گئے؟ اور اگر اُن کو بھی تم حقیقت نہیں کہتے تو یہ تو نہ کہو کہ ہمارے دلائل ناکافی ہیں، آلات عمل ناقص ہیں اور عالم سراسر نقش تخیل ہے۔

پھر یہ گروہ دوسرے فریق کی طرف مخاطب ہوتا ہے:۔ دوستو! یاد ہوگا کہ تم نے اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ ''ہم کو دلائل و تجارب نے جن نتائج و استنباطات تک پہنچایا ہے وہ اُس وقت تک یقینی ہیں جب تک اُن کے خلاف کوئی دلیل صحیح قائم نہ ہو''۔ اِن فقروں سے ظاہر ہے کہ تم اپنے موجودہ دلائل و نتائج کو متیقن اور غیر ممکن الخطا نہیں سمجھتے ہو، پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جن معلومات و متخیلات کی صحت کی بنا پر ان دلائل و نتائج کو تم یقینی سمجھتے ہو وہ صحیح نہ ہوں، اور تم قلتِ معلومات، یا نقص آلاتِ فکر یا خطائے طریق فکر کی بنا پر غلطی سے صحیح یقین کر رہے ہو، اور مسائل متعددہ میں تم کو اپنی یہ غلطی روزانہ نظر آتی ہے، پھر کوئی سبب معقول نہیں ہے کہ تم اپنے موجودہ حقائق و نتائج کو اگر غلط نہ یقین کرو تو صحیح بھی یقین نہ کرو۔ یہ تین فرقے فلسفہ کے تین اسکول یا تین اصول ہیں۔

اول توہمیہ یا سوفسطائیہ جو عالم میں حقیقت کا قائل نہیں یعنی نفی حقیقت کرتا ہے۔

دوم ایقانیہ جو عالم میں حقائق کا قائل اور اُن کے علم و معرفت کا مدعی ہے، یعنی اثبات حقیقت کرتا ہے۔

سوم تشکیکیہ یا لاادریہ جو ان دونوں کے وسط میں ہے نہ وہ توہمیہ کی طرح نفی حقیقت کرتا ہے، اور نہ ایقانیہ کی طرح اثباتِ حقیقت بلکہ وہ نفی و اثبات دونوں میں متردد ہے۔ واقعات، دلائل اور نتائج سب اُس کے سامنے ہیں، لیکن اُن میں سے نہ کسی کی صحت کا مدعی ہے اور نہ کسی کی خطا کا۔ وہ کہتا

ہے کہ ممکن ہے کہ صحیح ہو یہ اور ممکن ہے کہ صحیح نہ بھی ہو۔

فرقہ تشکیکیہ جس کو عربی میں عموماً ''لاادریہ'' کہتے ہیں، اور جو لفظی ترجمہ ہے Agnostic کا مسیح سے تقریباً چار سو برس قبل اس کی بنیاد یونانؔ میں پڑی تھی۔ اس مذہب کا موسس اول یونانی فلاسفر ''پیرون'' ہے جو ۳۸۴ (قبل مسیح) میں پیدا ہوا تھا۔ سکندر کے حملہ مشرق میں یہ شریک تھا، اس لیے اکثر مورخین کا یہ بیان ہے کہ پیرونؔ نے ایران و ہندوستان کے فلسفہ کو بھی ان ممالک کے علماء سے حاصل کیا تھا۔

پیرونؔ کے فلسفہ کا سنگ بنیاد جس کی طرف اوپر کی سطروں میں بھی اشارہ ہو چکا یہ ہے کہ انسان جب عدم سے وجود میں آتا ہے اس کے چاروں طرف سینکڑوں چیزوں کا وجود ہوتا ہے۔ اب اس کے لیے دو راہیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جو وہ سمجھتا ہے اُس کو وہ حقیقت غیر قابل نقص سمجھ لے، یا ہر چیز کا انکار کر دے کہ وہ حقیقت سے معریٰ ہیں اور یہ دونوں افراط و تفریط سے خالی نہیں اسی لیے اب انسان کے سامنے صرف تیسری راہ ہے کہ کسی شئے پر کوئی حکم نہ کیا جائے۔

حقیقی لاادری اس سنگ بنیاد کو حقیقت نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ یہ بھی حکم علی الشی ہے اور وہ نہیں جانتا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ اکثر اشخاص بظاہر حال اس نظریہ کو سُن کر ہنس دیں گے، لیکن حقیقت میں یہ کوئی ہنسنے کی شئے نہیں ہے بلکہ ایک دقیق امر ہے بعض لوگ نافہمی سے اعتراض کرتے ہیں کہ دنیا میں سینکڑوں چیزیں ہیں جن کا علم ہم کو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً حرارتِ نار، برودت آب، صلابت سنگ نرمی حریر ہاتھ سے چھو کر، آنکھ سے دیکھ کر زبان سے چکھ کر اور کان سے سن کر تم بدیہی شئے پر فطرۃً اور بداہتہً مختلف حکم کرتے ہو، اور کبھی تم کو شک نہیں ہوتا، پھر کیوں کر کہتے ہو کہ ہم کسی شئے پر حکم نہیں کرتے۔ لیکن اس قسم کے اعتراضات، حواس و آلات فکر کے طرقِ علم و معرفت سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اولاً یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے تمام دلائل و براہین کا مبنی کیا ہے؟

صرف دو چیزیں، استعمالِ حواس اور استقرا۔ لیکن ان میں سے کون سی چیز ہے جو خطا سے معصوم ہے؟

حواس علی الاقل پانچ ہیں ۔ باصرہ، سامعہ، ذائقہ، لامسہ، شامہ ۔ باصرہ سے ہم صرف نور اور لون کا احساس کرتے ہیں، سامعہ آواز کو دریافت کرتی ہے، ذائقہ لذت کو، لامسہ سختی و نرمی کو، اور شامہ بُو کو۔ اب جو تم کسی چیز کو دیکھتے ہو تو کہتے ہو کہ یہ پتھر ہے لیکن تم نے کیوں کر جانا کہ پتھر ہے؟ آنکھ تم کو صرف اُس کا سیاہ یا سپید رنگ بتاتی ہے، اور قوتِ لامسہ صرف اُس کی سختی کو محسوس کرتی ہے لیکن کیا پتھر ہونے کے ثبوت کے لیے صرف یہی مقدمات کافی ہیں کہ یہ شئے سیاہ اور سخت ہے اور جو شئے سیاہ اور سخت ہو وہ پتھر ہے، اس لیے یہ پتھر ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک لوہے کے ٹھوس جسم پر یا ایک منجمد مادّہ پر سیاہ رنگ چڑھا دیا جائے؟ تم کو خود اس قسم کی غلطیاں ہمیشہ پیش آتی ہیں۔

ثانیاً: تم کو حواس کی غلطی سے بھی انکار نہ ہوگا، جب تم کسی سریع الحرکتہ شئے پر سوار ہوتے ہو تو تمھاری سریع الحرکتہ سواری ساکن اور ساکن زمین متحرک نظر آتی ہے، کبھی کبھی تم کو چاند متحرک نظر آتا ہے، حالاں کہ اُس کے نیچے ابر حرکت کر رہا ہے اور اس قسم کی بیسیوں مثالیں تم خود پیش کرتے ہو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اور دوسرے امور میں جن مشاہدات و تجارب پر تم اپنے اصول و نتائج کی بنیاد قائم کرتے ہو، وہ حواس کی غلطی سے محفوظ ہوں۔

ثالثاً: حواس سے تم ایک شئے کا مشاہدہ کرتے ہو اُس پر ایک حکم قائم کرتے ہو اور اُس کو تم مبنی علی المشاہدہ اور مبنی علی البداہتہ سمجھتے ہو، حالاں کہ تمھیں خبر نہیں کہ جلدی میں غیر مشاہد راستوں کو بھی طے کر گئے ہو۔ جب تم نے ایک سیاہ شئے کو دیکھ کے کہا کہ پتھر ہے، تو تم نے فرض کر لیا ہے کہ ہماری نظر ہم کو دھوکا نہیں دے رہی ہے معلوماتِ سابقہ کی بناء پر بغیر چھوئے تم نے سختی بھی محسوس کی، اس کے بعد تم نے یہ فرض کیا ہے کہ یہ صفات جس میں ہوا، وہ پتھر ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک محتاج دلیل ہے۔

فرقۂ تشکیکیہ، ایقانیہ کے مقابلہ میں حسبِ ذیل دس اصول قائم کرتا ہے۔

(۱) مقدارِ عمر، ترکیبِ جسم، قوتِ حواس اور درجۂ احساس میں تمام انسان مختلف ہیں، اور اس لیے ایک ہی شے میں مختلف اشخاص کو جو مقدارِ عمر، ترکیبِ جسم، قوتِ احساس اور درجۂ احساس میں مختلف ہیں مختلف حیثیات اور خصائص نظر آتے ہیں۔

(۲) اخلاقی اور تشریحی حیثیت سے افرادِ انسان مختلف ہیں، اس لیے مختلف امور کے متعلق ان کے احساسات بھی مختلف ہوں گے۔

(۳) ایک ہی انسان میں متعدد اعضائے حساسہ ہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر عضو ایک خاص کمیت و مقدار وغیرہ کو محسوس کرتا ہے، اس لیے یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ جو خصوصیت و خاصیت تم کو نظر آ رہی ہے وہ خود اُس شئے میں موجود ہے یا تمھارے اعضائے حساسہ میں ہے؟

(۴) ایک ہی انسان ایک ہی شے کو خواب، بیماری، حزن اور غم، پیری اور ضعف کی مختلف حالتوں میں مختلف طور سے محسوس کرتا ہے پھر کس طرح یقین کیا جائے کہ تم جو ایک خاص حالت میں ایک شے محسوس کرتے ہو، اور پھر دوسری حالت میں اُس کو ایک اور شے محسوس کرتے ہو، کیوں کر کہا جائے کہ ان مختلف حالات کے احساس میں کون سا احساس صحیح ہے؟

(۵) کسی شے پر کوئی حکم عموماً اس کے صفات و خصائص ظاہری پر موقوف ہوتا ہے اور صفات و خصائص کا یہ حال ہے کہ قلت و کثرت اور زیادت و نقص کی حالت میں بالکل بدل جاتے ہیں۔ اب جب تم ایک مقدارِ مخصوص کو مشاہدہ کر کے اُس پر کوئی خاص حکم قائم کرتے ہو تو کیا یہ غیر ممکن ہے کہ اُس کی کم و بیش مقدار میں وہ صفات و خصائص بدل جائیں؟

(۶) کسی شے کے متعلق جب کوئی حکم کوئی انسان کرتا ہے تو یہ حکم صرف مشاہدہ پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ اُس میں اُس کی تربیت خاص، عقائد خاص، پابندی بعض قوانین خاص اور سوسائٹی کے مخفی اثرات کا بہت کچھ حصہ شامل ہوتا ہے یہی وجوہ ہیں کہ مختلف التربیتہ، مختلف العقائد مختلف الاقالیم اشخاص، مسائل کثیرہ میں ہمیشہ مختلف الآراء رہتے ہیں۔

(۷) اشیائے عالم باہم اس قدر مختلط ہیں کہ ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہوسکتیں، اس لیے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جس شے پر تم کوئی حکم کرتے ہو وہ مستقلاً بھی اُس شے کے لیے صحیح ہو؟ تم اشیا کے خصائص بتاتے ہو، لیکن کیا اُس میں مواد مختلطہ کے خصائص شامل نہیں؟ جب تم آنکھ سے ایک رنگ دیکھتے ہو تو کیا اُس میں اخلاطِ چشم کے خصائص داخل نہیں؟

(۸) ایک ہی شے مختلف قرب و بعد، مختلف جوانب وسمت رویت مختلف اسباب رویت کی بناء پر مختلف نتائج پیدا کرتی ہے، پھر ایک خاص مقدار قرب و بعد، ایک خاص سمت رویت، بعض خاص اسباب رویت میں جو چیز نظر آتی ہے بالکل ممکن ہے کہ دوسری حالتوں میں وہی شے اور کیفیات میں نظر آئے۔ پھر اُن میں سے کون حقیقی ہے؟

(۹) قلت و کثرت التفات وتوجہ، مختلف نتائج ظاہر کرتی ہے پھر جس مقدار توجہ وفکر سے تم ایک حالت کا اندازہ کررہے ہو، اُس سے کم یا زیادہ توجہ وفکر کی حالت میں دوسری حالتیں پیدا ہوتی ہیں، کون صحیح ہیں۔

(۱۰) ہم جب کسی چیز پر کسی قسم کا حکم کرتے ہیں تو عموماً ہمارے حواس نامعلوم قیود اور بندشوں میں گرفتار ہوتے ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب ہم اُن سے آزاد ہوتے تو ہم کیا حکم کرتے؟

ان اصول عشرہ کے علاوہ فرقہ تشکیکیہ کے اور بعض اہم اصول بھی ہیں جن کی تفصیل وقت طلب ہے۔

فلسفہ تشکیکیہ کا سنگ بنیاد جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے مسیح سے ۴۰۰ برس قبل رکھا گیا تھا، اس کے بعد ہمیشہ اس کے اعوان واتباع ہر عصر میں موجود رہے ہیں۔ فلاسفہ یورپ میں بھی اس خیال کی کمی نہیں مشہور فیلسوف ' ہکسلے واسپنسر اسی فلسفہ کے مرید تھے، حقیقت یہ ہے کہ ایک فلسفی اسرار عالم کو جس حد تک کھولتا ہے اُس کے سامنے پھر گرہیں نظر آتی ہیں اُن کو کھولتا ہے تو کچھ اور عقیدے جابجا پیدا ہوجاتے ہیں۔

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گشت رازِ دگر آن راز کہ افشا می کرد

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا، جب انسان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ محسوسات میں بھی اُس کو مشکل سے تیقن وعدم تیقن کے فیصلہ کرنے میں کامیابی ہوتی ہے تو جو امور ماورائے احساس و مافوق الطبیعتہ ہیں اُن کی نسبت کیوں کر فیصلہ ہوگیا کہ باطل محض اور حدیث خرافہ ہیں، افی اللہ شک فاطرالارض والسماء!

ماہنامہ العصر اکتوبر 1916ء

☆☆☆

ابتدائے عشق

الہلال پریس کی ضمانت

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد

اطراف ملک سے بکثرت خطوط اور تار آرہے ہیں جن میں دریافت کیا جارہا ہے کہ کیا ضمانت کی خبر صحیح ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ بعض امور کی اطلاع مجھے تقریباً دس ماہ سے تھی، مگر آج تک الہلال میں ان کی نسبت ایک حرف نہیں لکھا۔ اس لیے کہ اپنا اصول کار ابتداء سے یہ رہا ہے کہ انسان صرف کام کے لیے بنایا گیا ہے پس اس کو چاہیے کہ صرف اپنے کام ہی میں لگا رہے۔ یہ بہت ہی ادنیٰ درجہ کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کام کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیسا سمجھتے ہیں؟

میری حالت الحمدللہ کہ عام حالت سے مختلف ہے، میں اپنے تمام کاموں کو ایک خالص دینی دعوت کی حیثیت سے انجام دیتا ہوں اور میرے پاس احکام دینی کے قوانین کی ایک کتاب موجود ہے۔ پس میری نظر ہمیشہ اس پر رہتی ہے کہ خدا کے ساتھ میرا رشتہ کیسا ہے؟ اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس کے بندوں کی نظریں کیا کہتی ہیں۔ اگر اللہ کی صداقت میرے ساتھ ہے، تو میری طاقت لازوال اور میری حفاظت قدرتی ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ آگ جلاتی اور پانی ڈبوتا ہے اور اس کو قوانین قدرت کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن اس سے زیادہ محکم اعتقاد اور اس سے بڑھ کر غیر متزلزل یقین کے ساتھ میں بھی دیکھتا ہوں کہ حق وصداقت اور اللہ کا پیغام دعوت ہر حال میں

فتحیاب ومنصور ہوتا ہے اور باطل ضلالت کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا خواہ کتنا ہی ساز وسامان ہو اور عارضی ووقتی کامیابیاں خواہ کتنا ہی اسے مغرور کردیں لیکن بالآخر وہ خاسر ونامراد ہی ہوتی ہے۔ و تلك الدار الحضرة نجطها للذين لا يريدون فى الارض علوًا ولافسادًا والعاقبة للمتقين۔ پس ہماری حفاظت اور کامیابی خود ہمارے اور ہمارے کاموں کے اندر ہے اپنے سے باہر ڈھونڈھنا لاحاصل ہے۔ وفى انفسكم افلا تبصرون۔

الہلال کی اشاعت کو تقریباً ڈیڑھ برس کا زمانہ ہوگیا، مگر وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے دینی فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا اگر پریس ایکٹ کا عمل اس کے ادعائی مقصد سے مختلف نہ ہوتا تو موجودہ عہد مطبوعات اس کی سبب سے فرصت کا ملنا کچھ بھی تعجب انگیز نہ تھا بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ قدرتی اور لازمی تھا۔

لیکن بدقسمتی سے جو حالت آج برسوں سے ہورہی ہے، اس کا نتیجہ، مشئوم تو یہ ہے کہ نہ صرف ہر حق گو کو، بلکہ ہر حق گوئی کے ارادے کرنے والے کو اپنے تئیں سب سے بڑا مجرم سمجھنا چاہیے بلکہ

وجودك ذنب لايقاس به ذنب

جب حالت یہ ہو تو پھر ڈیڑھ برس سے زیادہ زمانے کا بغیر کسی واقعہ کے گذر جانا کیوں نہ ایک محیر العقول واقعہ سمجھا جائے۔

فی الحقیقت یہ ایک ایسا تعجب انگیز واقعہ تھا، جسے سوچتے سوچتے بہت سے لوگ گھبرا اُٹھے تھے البتہ خود مجھے ذرا بھی تعجب نہ تھا۔ کیونکہ لا خوف عليهم ولا هم يحزنون کی تفسیر میرے سامنے تھی، اور دنیا کے قوانین سے بھی بالاتر ایک قانون تھا جس نے میرے دل پر نقش کر دیا تھا کہ والله ولى المتقين۔

بہر حال ۱۸ر ستمبر کو دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی جس میں ۲۷ر تک داخل کرنے کی

قید تھی، مگر آج ۲۳ رویں تاریخ ہے، دو ہزار روپیہ کے گورنمنٹ ضمانتی کاغذ عدالت میں بھیج دیئے گئے ہیں، ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن الہلال پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لیے ہم نے روپیہ نکالا تھا، سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اُکتا گئے تھے، اور اب تو وقت آ گیا تھا، کہ اگر کوئی مانگنے کے لیے نہ آتا تو ہم خود ہی پیشکش کرنے کے لیے آگے بڑھتے، بارہا ہمیں خیال ہوا کہ کیا یہ ذوق عتاب صرف اوروں ہی کے حصے میں آیا ہے اور ہم اصلی مستحقین نظر کے لیے کچھ بھی نہیں۔

نہ کنی چارہ اب خشک مسلمانے را

اے بہ ترسابچگاں کردہ مے باب سبیل

ہمارے ایک دوست تو اس تغافل پیشگی سے عاجز آ کر پریس ایکٹ کی طاقتوں ہی کے منکر ہو گئے تھے۔

لے بھی جائیں دل کہیں ہم سے کہ قصہ پاک ہو

یہ حسینان جہاں بھی دلربا کہنے کو ہیں

بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومی قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوتی ہے تو آئندہ کی فکر کے لیے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟ بالآخر غنیمت ہے کہ خدا خدا کر کے خاموشی ٹوٹی، اور پہلی منزل سے بہر حال گزر ہی گئے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

آخر میں ہم یہ لکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس بارے میں ہمیں گورنمنٹ آف بنگال سے کوئی شکایت نہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اور کل تک کیا تھا اور آج کیا ہو رہا ہے؟

سر ایں فتنہ ز جائیست کہ من میدانم

ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصے تک جو کچھ ہوا، وہ گورنمنٹ کی مصلحت شناسی عواقب اندیشی، اور ہمارے خاص حالات و نتائج پر نظر رکھنے کا نتیجہ تھا، اور جو کچھ ہوا ہے، یہ دوسروں کی نادانی کا نتیجہ ہے۔

ہم نے اتنی سطریں بھی بہ مجبوری لکھیں، کہ بے شمار خطوط اور تاروں کا فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہ تھا، ورنہ ہم اس طرح کے واقعات کو اس درجہ اہم نہیں سمجھتے کہ ان کے پیچھے زیادہ وقت صرف کیا جائے۔ یہ اس طرح کی معمولی باتیں ہیں جو آج کل کے پریسوں کے دفتروں میں ہمیشہ پیش آتی رہتی ہیں اگر بعض حکام اعلیٰ کو کسی اخبار کے دفتر سے کچھ روپیہ لے کر رکھنے میں مصلحت نظر آتی ہے، تو یہ ایک ایسی فائدہ رسانی ہے جو دوسروں کے لیے مفید مگر اپنے لیے مضر نہیں، پھر اس میں کیوں عذر ہو، اور کیوں حرف شکایت زبان پر آئے؟ ہمارے سامنے تاریخ نے جو مواد رکھ دیا ہے، وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ ایسی باتیں ہمیشہ ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اور نتیجہ بھی ہمیشہ یکساں نکلا ہے اور نکلے گا۔ جو لوگ اس راہ میں قدم رکھتے ہیں، جب ان کے سامنے آخری منزلیں موجود ہیں تو ان ابتدائی منزلوں کے پیش آنے پر کیوں شاکی ہوں؟

ترک جان و ترک مال و ترک سر

در طریق عشق اول منزل ست

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

نگارشات آزاد

☆☆☆

زندہ دِلوں کا وطن

یہ مانا کہ کسی ملک کی آب وہوا جسم انسانی کے لیے کوئی خاص اثر رکھتی ہو، مگر یہ تو کچھ ضروری نہیں کہ ایک سرزمین کا اخلاق بگڑنے پر آئے تو پورے خطے کی حالت یکساں بگڑ جائے، ہم عرصہ سے دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب کے اخبارات گو خریداروں کے پیدا کر لینے اور نئے نئے کارخانوں کے چلا لینے میں ترقی کر رہے ہیں۔ مگر ان کا اخلاقی تنزل نہایت درد انگیز ہے۔ کل کی بات ہے کہ (زمیندار) اور (وطن) میں جوتی پیزار ہو رہی تھی، اور جس طرح پنجاب میں پہلوانوں کے دنگل ہوا کرتے تھے، اسی طرح دونوں پہلوان ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ (زمیندار) کا صرف یہ قصور تھا کہ تھوڑے دنوں کے اندر ہی اس کی اشاعت پرانے اخباروں سے کیوں بڑھ گئی اور کیوں وہ لاہور کے چند دولت مندوں کی پرستش سے انکار کرتا ہے؟ انسان کے تمام قصور معاف ہو سکتے ہیں مگر ایک دوکاندار اس شخص کو تو کبھی معاف نہیں کر سکتا جس نے اس کے سامنے کی جگہ کی خالی دوکان پر قبضہ کر کے راہ کے خریداروں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔

ہمارے عقیدے میں یہ نتائج صرف اس بات کے ہیں کہ پنجاب میں تجارت کی ترقی نے بالعموم دکاندارانہ اخلاق پیدا کر دیا ہے، اور اغراض پرستی کی ہوا میں سب پل رہے ہیں، تجارتی زندگی کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ شب و روز باہم تصادم و تسابق ہو، اور ملکوں میں ایسے موقعہ پر تجارت ہی کے میدان میں پیچ لڑائے جاتے ہیں، مگر یہاں یہ تدبیر اختیار کی گئی ہے کہ تلوار کی جگہ قلم کا وار کر کے بہ اطمینان حریف کی دوکان لوٹ لی جائے۔

یہ قصہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے۔ کیکر سنگھ نے غلام پہلوان سے عاجز

آ کر اس کی کنپٹی پر مکہ کی ایک سخت ضرب لگا دی تھی۔ اسی طرح یہ قلم و کاغذ کے پہلوان جب عاجز آ جاتے ہیں، تو پھر ایک دوسرے کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ فحش اور مغلظات سے بھی انھیں دریغ نہیں۔ ایک اپنے حریف سے پوچھتا ہے کہ وہ زمانہ بھی یاد ہے جب کالج میں پڑھتے تھے؟ دوسرا کہتا ہے کہ زیادہ باتیں نہ بناؤ، ورنہ میں تمہارا فلاں راز فاش کر دوں گا۔ اب یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ ایک دوسرے کو چور اور ڈاکو بتلاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ تم نے طرابلس کے نام پر روپیہ کھا لیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ فرضی کمپنیاں بنا کر قوم کو لوٹ لیا۔ یہ حالت صرف مسلمانوں ہی کی نہیں ہے۔ بلکہ اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ ہندو اور آریا اخبارات کو کھولیے تو وہ بھی ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے شریفانہ شغل ہی میں خوش ہیں۔ بدبختو! صرف تم ہی ذلیل نہیں ہو، بلکہ تمہاری تمام قوم اور پورا ملک ذلیل ہے۔ جس قوم پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے، پہلے اس سے حکومت چھین کر غیروں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل نے جب خدا سے منہ موڑا تو ان پر ایک باہر کی قوم بھیج دی گئی۔

بعثنا علیکم عباداً لنا اولی باس شدید

پھر ہم نے تم پر ایک سخت و شدید قوم کو مسلط کر دیا۔

جب اس پر بھی باز نہیں آتے تو پھر فسق و فجور، حسد و حقد، ہوا پرستی و نفسانیت، نااتفاقی و بیگانگت میں ان کو مبتلا کر دیتا ہے۔ خود ہی کٹتے ہیں۔ اور خود ہی مر جاتے ہیں۔

وما اھلکنا قریة الا واھلھا ظالمون

اور ہم کسی آبادی کو تباہ نہیں کرتے۔ مگر اس وقت جبکہ وہ ظلم و معاصی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے معاصرین سے بہ منت التجا کرتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی ملت پر نہیں تو خود اپنے اوپر رحم کریں، اور مسلمانوں کی موجودہ ذلت و رسوائی پر قناعت کر لیں۔ نفسانیت و خود پرستی کی

حد ہوگئی ہے اور خدا کی طرف سے سب نے منہ موڑ لیا ہے۔ تعجب ہے کہ ساری دنیا آپ پر ہنس رہی ہے اور آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اوپر رونا نہیں آتا؟ ملک ملت کی خدمت شائد اس طریقے سے الگ ہو کر بھی کی جاسکتی ہے، یہ تو کچھ ضروری نہیں کہ جب تک آپ ایک دوسرے کو چور ثابت نہ کرلیں گے اس وقت تک آپ کی زیر اصلاح قوم آپ کو اپنا امین نہ سمجھے گی۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

☆☆☆

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ

پیغام اصلاح وہدایت

میں تمھارے سامنے عربی کے دو لفظوں کی تشریح کروں گا، تاسیس اور تجدید دو لفظ ہیں، تاسیس، اساس سے ہے اور یقیناً تم اساس کے لفظ سے بے خبر نہیں ہوگے پھر بھی میں روزمرّہ کی زبان میں اس لفظ کا ترجمہ بتادوں، اساس بنیاد اور تاسیس، بنیاد رکھنے کو کہتے ہیں۔ اور دوسرا لفظ تجدید ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ پہلے سے کوئی چیز موجود تھی لیکن کسی خرابی یا غفلت کی وجہ سے وہ محتاج مرمت ہوگئی ہے، اب کوئی نئی بنیاد نہیں رکھ رہے ہیں۔ بنیاد موجود ہے۔ چیز کا وجود ہے لیکن دیکھ بھال نہ کرنے کی وجہ سے لائق توجہ تھی، تم نے اُس کی درستی کر کے اُس میں تازگی پیدا کردی، ہریالی پیدا کردی، پس تمھاری بول چال میں جو چیز درستگی و مرمت ہے اُسی کو عربی میں تجدید کہتے ہیں اور کسی چیز کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کا نام تاسیس ہے۔

میں اپنے مقصد سے تمھیں نزدیک کرنے کے لیے ایک مثال دیتا ہوں، ایک مکان ہے یہی گھر جس میں تم رہتے ہو فرض کرو کہ اب تک گھر نیا نہیں ہے چاہتے ہو کہ تعمیر کرواؤ، اس کے لیے تم نے زمین منتخب کر کے نقشہ کے مطابق بنیاد تیار کی اور مکان تعمیر کرلیا۔ پس یہی تعمیر اور یہی تیاری تاسیس کہلائے گی۔ اب تجدید کیا ہوئی؟ تجدید یہ ہے کہ جب تک مکین آباد رہے اور دیکھ بھال اور مرمت کی طرف سے غفلت نہ برتے، مکان کی زیب و زینت، تازگی اور خوشنمائی میں فرق نہ آیا لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ زمانہ کی رنگینیوں میں پڑ کر تم نے مرمت کی طرف سے غفلت برتی، مکان مرمت کا محتاج ہو گیا، مرمت کردی گئی تو گذری ہوئی رونق پھر واپس آگئی۔

میں نے اس مکان کی مثال دی جو اینٹ، چونے سے بنایا جاتا ہے، تاکہ تم سمجھ لو کہ تاسیس کیا ہے؟ اور تجدید کیا ہے؟ ورنہ میرا مقصد اس مکان کی تاسیس اور تجدید کا ہے جس کا نام اسلام ہے، عالم کون و فساد میں تم دن رات دیکھتے ہو سربفلک عمارتیں بنائی جاتی ہیں،۔۔۔۔۔ڈھائی جاتی ہیں کہیں کوئی چیز بن رہی ہے کہیں کوئی چیز بگڑ رہی ہے اور یہی حال تقریباً مذہب کے ہر گوشہ کا ہے یا بن رہا ہے، سنور رہا ہے، یا بگڑ رہا ہے اور منتشر ہو رہا ہے، دنیا میں اور جتنی عمارتیں بنتی ہیں، غریب کا جھونپڑا ہو یا بادشاہ کا محل سب اسی اینٹ چونے سے تعمیر ہوتی ہیں۔ لیکن میں جس عمارت کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ اینٹ چونے سے نہیں، انسانی دلوں سے تیار کی گئی ہے، گوشت اور خون سے تعمیر ہوئی ہے اُس کا نام اسلام ہے۔

تم نے کبھی غور کیا کہ اس عمارت یعنی اسلام کا کیا حال ہے؟ یہ عمارت اب نئی تعمیر نہیں ہو رہی ہے تعمیر ہو چکی ہے قرن ہا قرن گزر گئے کہ بن چکی ہے، مٹ گئے ہیں کہ نہیں گئی، موجود ہے، موجود رہے گی۔ لیکن اُس کے وارثین و نائبین کی غفلتوں اور بے پروائیوں کی وجہ سے مرمت کی محتاج ہو گئی ہے اور اسی عمارت کی یہ اینٹیں ہیں جو اس وقت میری چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں، اس عمارت کے قیام اُس کی درستی، اُس کے تحفظ، اس کی بقاء کے لیے تاسیس کی ضرورت نہیں تجدید کی ضرورت ہے عمارت موجود ہے، خرابی آ گئی ہے۔ وہ اگر دور کر دی جائے تو اُس کی شان پھر دوبالا ہو سکتی ہے، حالت نکھر سکتی ہے، سنور سکتی ہے، البتہ زمانہ کے ساتھ حالت بدل جاتی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھڑکیاں نیچی ہیں بلند کر دی جائیں، روشن دان تبدیل کر دیے جائیں، اساس مضبوط ہے، بنیاد مستحکم ہے، ضروریات کے مطابق چند معمولی ترمیم و تزئین کے بعد اُسے ضروریات زمانہ کے قابل بنا دیا جائے۔

اقوام عالم آج کسی ایسے حل کی تلاش میں حیران و سراسیمہ ہیں جو اُن کی معاشی گتھیوں کو

سلجھا سکے، اسکیمیں بنتی ہیں بگڑتی ہیں تجویزیں پاس ہوتی ہیں اور فیل ہوتی ہیں، تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری ہے بڑے بڑے دماغ دن رات ایک کیے ہوئے ہیں، اُنہوں نے اپنے لیے خواب و خور حرام بنا لیا ہے، مگر صحیح تعبیر نہیں پاتے، سب کے سامنے آج جو سوال ہے وہ گو تعمیر ہی کا ہے، تخریب کا نہیں سعی امن ہے، کوشش اضطراب نہیں فکر اصلاح ہے تلاش فساد نہیں، سکون راحت کی خواہش ہے مگر اصلی گُر اور حقیقی نسخہ سے چوں کہ گریز ہے لہٰذا کچھ بھی حاصل نہیں اور جس کے پاس یہ نسخہ اکسیر ہے وہ استعمال سے جی چُرا رہا ہے۔

قوموں کی زندگی میں دو عملی کا زمانہ نہایت خطرناک زمانہ ہوتا ہے، اس کوشش میں قوموں نے یا تو افراط کی راہ اختیار کی ہے یا تفریط کی۔ اور یہ دونوں راہیں غلط ہیں، فکر و عمل کی طرح زندگی کی راہ میانہ روی کی راہ ہے، اس کے علاوہ دوسری جتنی بھی راہیں ہیں غلط ہیں تباہی و بربادی کی راہیں ہیں۔

پس اگر تجدد کی زندگی میں بڑھے غلطی کی، گمراہی میں پڑے اور قدامت پرستی کی راہ اختیار کی تو زمانہ نے پاؤں تھام لیے چلنا محال ہو گیا۔ یہ روش بھی غلط ہے۔ ضرورت ہے ایک انجینئر کی، ایک معمار کی، ایک ایسے زمانہ شناس کی جو ایک نظر میں بھانپ لے کہ مکان میں کہاں کہاں مرمت کی ضرورت ہے، کہاں کہاں تجدید کی ضرورت ہے کس در اور کس دیوار کو تبدیل کرنا چاہیے، اور کس کو اپنی جگہ پر چھوڑ دینا چاہیے؟

پس حقیقت واضح ہو گئی وہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عقلی زندگی کی رفتار کا جہاں تک تعلق ہے، افراد و جماعت کی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے ایک حقیقت ہے، بشرطیکہ آنکھ کے پپوٹوں کو کوئی سی نہ لے، ہر شخص اس حقیقت کو دیکھ سکتا ہے۔ ہر ناظر فدار نگاہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ عمارت بہترین ہے، بنیاد مضبوط اساس ناقابل تبدیل ہے لیکن ضرورت ہے مرمت کی، درستگی کی تزئین کی،

نئے ساز و انداز کے ساتھ سجاوٹ کی، تاریخ کا اٹل فیصلہ بھی یہی ہے کہ اصلح جماعت اس سے زیادہ کوئی نہیں، موجودہ زمانہ کی ضرورت کا جہاں تک تعلق ہے ہر جماعت پیچھے نہیں دیکھتی، آگے دیکھتی ہے لیکن ان سب نے اپنے لیے جو کچھ ریفارم کیا ہے، جو بھی ہے جتنا بھی ہے، نا قابل اطمینان ہے، خود انہیں بھی اس پر بھروسہ نہیں، مگر اسلام کی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے، اُس کی کشش و دل آویزی کا جہاں تک تعلق ہے، اُس کے نظم وضبط کا جہاں تک تعلق ہے، بلا شبہ اتنا عالمگیر ہے کہ یہی نہیں کہ زمانہ اُس کا ساتھ دے بلکہ یہ کہ اگر مسلمان، مسلمان ہو جائیں تو زمانہ اس کا استقبال کرے گا۔

دوسروں کی تعلیم وقوانین اور اسلام کے تعلیم وقوانین کا یہ فرق اتنا نمایاں فرق ہے کہ جب اس پر غور کرتا ہوں تو بعض اوقات مجھ پر جنون سا طاری ہو جاتا ہے، میں حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ حقیقت سب پر کیوں منکشف نہیں ہو جاتی ہے، اسلامی قوانین کو تم ایک طرف رکھو، اور انسانی ضروریات کے ہر گوشہ کو دوسری طرف، پھر دیکھو کہ اس کی معاشی ومعاشرتی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے اُس کی تمدنی و مذہبی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے اس تعلیم نے تمام وکمال طور پر ہر گوشہ کو دیکھا اور جزوی وکلی طور پر علاج تجویز کیا ہے، پس ضرورت ہے استعمال و پرہیز کی، مرمت کی، تجدید کی، نہ کہ تعمیر وتاسیس کی، کسی نئے راستہ کی ضرورت نہیں، اسلام کا راستہ صاف و بے خطر ہے، ہاں ضرورت ہے ان کانٹوں اور روڑوں کے صاف کر دینے کی جن سے اجنبی کھٹک رہے ہیں اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے دوسری راہوں میں بھٹک رہے ہیں۔

قدامت اب باقی نہیں رہ سکتی لیکن تجدد میں غلو مفید نہیں مضر ہوگا، آج اسی نسخہ کے استعمال کی ضرورت ہے جو تیرہ سو سال پہلے ایک ہادی وحکیمؐ نے تجویز کیا تھا میں زیادہ تفصیلات میں اس وقت نہیں جانا چاہتا لیکن جن دوررس نگاہوں نے اس تعلیم کو سمجھا ہے۔ اور جس وقت سمجھا اور عمل پر تیار ہوئے ہیں سعادت قدم لینے کو بڑھی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمیں آج کسی تجدید کی ضرورت نہیں، نہ

ضرورت ہے نئی بناوٹ کی، بلکہ وقت اس بناوٹ کے سنوارنے کا ہے وقت اصلاح کیفیت کا، اصلاح صورت کا ہے۔ آج اگر مسلمان صرف اتنا کریں کہ جو ادارہ عمل اصلاح کا موجود ہے اُس کی اصلاح کرلیں تو اُن کی بے شمار ضرورتوں کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر میں پھر اسی لفظ پر آجاتا ہوں، جس کی طرف میں تمھیں توجہ دلاتا رہا ہوں۔ اور جس حقیقت کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں یعنی تنظیم زکوٰۃ اور قیام بیت المال۔

مسلمانو! بحیثیت قوم کے اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو تم پر فرض ہے کہ اپنی زندگی میں اپنے اندر اتنی قوت پیدا کرو کہ تمھارا جماعتی نظام درست ہو جائے اور اگر چاہتے ہو کہ اپنی زندگی میں اتنی قوت دیکھو جتنی اس دنیا میں ایک جماعتی زندگی کے لیے ضروری ہے تو اپنے منتشر شیرازہ کو فوراً سمیٹ لو۔ تمھارے مکان کی اساس و بنیاد مضبوط ہے اُس کی مرمت کی ضرورت ہے مرمت کرو۔ اور جلد مرمت کرو تا کہ گذری ہوئی رونق اب واپس آجائے اور تمھاری ساکھ پھر سے اقوام کے دردل میں قائم ہو جائے جو ہو چکا اُس کا غم نہ کیا جائے، جو باقی ہے اور جس کی حفاظت ابھی ممکن ہے، اُس سے غفلت کرنے کا اب وقت نہیں۔ ہر صبح تمھاری گمراہی کا ایک پیام سُناتی ہے۔ اور میری نگاہوں سے ہندوستان کی جماعتی زندگی کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں ہے بُرائی بہر حال بُرائی ہے، نادانی، حرص، کاروباری چبوترے سے اب چل نہیں سکتی۔ اُس دوکاندار سے زیادہ قوم کا کوئی دشمن نہیں ہے جن کے سائن بورڈ میں حرص وخود غرضی کا رنگ وروغن صاف اُبھرا ہوا موجود ہے۔

پس جہاں تک اندرونی جماعتی زندگی کا تعلق ہے، تمھارے لیے لازم ہے کہ اسلام کے عملی اداروں کو جن کو تم نے غفلت میں ڈال کر زندگی کی رونق گھٹادی ہے پھر سے درست واستوار کرلو۔ فلاح کونین تمھارے لیے وقف ہو جائے گی۔

☆☆☆

محدثین کرام کا تذکرۂ جمیل اور اُن کی مساعی جمیلہ

علم الحدیث کی صحت وسند پر تبصرہ و تحقیق

آج حدیث کا جو علم دنیا میں موجود ہے وہ تقریباً دس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے حاصل کیا گیا ہے، تابعین نے اُن کی صرف احادیث ہی نہیں لی ہیں بلکہ ان سب صحابہؓ کے حالات بھی بیان کردیے ہیں اور یہ بھی بتلا دیا ہے کہ کس نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کتنی صحبت پائی ہے، یا کب اور کہاں آپؐ کو دیکھا ہے اور کن کن مواقع پر آپؐ کو دیکھا ہے اور کن کن مواقع پر آپؐ کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ صحابہ کرامؓ میں جن حضرات نے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں اُن کی مرویات کی فہرست یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ (متوفی ۵۷ھ) احادیث ،احادیث کی تعداد ۵۳۷۴ ہے، ان کے شاگردوں کی تعداد ۸۰۰ کے لگ بھگ تھی اور اُن کے بکثرت شاگردوں نے ان احادیث کو قلم بند کیا ہے۔

حضرت ابو سعید حذریؓ (متوفی ۴۶ھ) مروی احادیث کی تعداد ۱۱۷۰ ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ (متوفی ۷۴ھ) مروی احادیث کی تعداد ۱۵۴۰ ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک (متوفی ۹۳ھ) مروی احادیث کی تعداد ۱۲۸۶ ہے۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ (متوفیہ ۵۸ھ) مروی احادیث کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ (متوفی ۷۰ھ) مروی احادیث کی تعداد ۱۶۳۰ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ (متوفی ۶۳ھ) مروی احادیث کی تعداد ۷۰۰ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (متوفی ۳۲ھ) مروی احادیث کی تعداد ۸۴۸ ہے۔

دورِ صحابہؓ سے امام بخاری کے دورِ صحابہؓ کے دور تک علم حدیث کی مسلسل تاریخ: دورِ صحابہؓ کے بعد اُن تابعین کو دیکھیے جنہوں نے صحابۂ کرامؓ سے سیرت پاک کا علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں تک اُس کو منتقل کیا، اُن کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف طبقاتِ ابنِ سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں اُن کی تعداد حسب ذیل ہے:

مدینہ منورہ میں ۴۸۴، مکہ معظمہ میں ۱۳۱، کوفہ میں ۴۱۳، بصرہ میں ۱۶۴۔

ان میں سے جن اکابر تابعین نے حدیث کے علم کو حاصل کرنے اور آگے پہونچانے کا سب سے بڑھ کر کام کیا ہے وہ یہ ہیں۔

حضرت سعیدؒ بن المسیب پیدائش ۱۴ھ وفات ۹۳ھ۔

حضرت حسن بصریؒ، پیدائش ۲۱ھ وفات ۱۱۰ھ۔

حضرت محمدؒ بن سیرین، پیدائش ۲۳ھ وفات ۱۱۰ھ۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ پیدائش ۲۲ھ وفات ۹۴ھ۔

حضرت امام علی بن امام حسینؑ امام زین العابدین پیدائش ۳۸ھ، وفات ۹۴ھ۔

حضرت مجاہدؒ، پیدائش ۲۱ھ وفات ۱۰۴ھ۔

حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ پیدائش ۳۷ھ، وفات ۱۰۶ھ۔

حضرت شریحؒ (حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں قاضی مقرر ہوئے) وفات ۷۸ھ۔

حضرت اسودؒ بن یزید، وفات ۷۵ھ۔

حضرت مسروقؒ (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں مدینہ آئے) وفات ۶۲ھ۔

حضرت مکحولؒ وفات ۱۱۲ھ۔

حضرت رجاءؒ بن حیوۃ، وفات ۱۱۲ھ۔

حضرت ہمامؒ بن منبہ، پیدائش ۴۰ھ وفات ۱۳۱ھ) حضرت ہمامؒ نے حدیث کا بہت بڑا تحریری ذخیرہ چھوڑا ہے۔

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر فاروقؓ وفات ۱۰۶ھ۔

حضرت نافعؒ مولیٰ حضرت عبداللہ بن عمر فاروقؓ وفات ۱۱۷ھ۔

حضرت سعیدؒ بن جبیر پیدائش ۴۵ھ، وفات ۹۵ھ۔

حضرت سلیمانؒ الاعمش، پیدائش ۶۱ھ، وفات ۱۴۸ھ۔

حضرت محمدؒ بن المنکدر، پیدائش ۵۴ھ، وفات ۱۳۰ھ۔

حضرت ابن شہابؒ زہری، پیدائش ۵۸ھ وفات ۱۲۴ھ۔

حضرت سلیمانؒ بن یسار پیدائش ۳۴ھ وفات ۱۰۷ھ۔

حضرت عکرمہؒ مولیٰ بن عباسؓ، پیدائش ۲۲ھ وفات ۱۰۵ھ۔

حضرت عطاءؒ بن ابی رباح، پیدائش ۲۷ھ وفات ۱۱۵ھ۔

حضرت قتادہؒ بن دعامہ پیدائش ۶۱ھ وفات ۱۱۷ھ

حضرت عامر الشعبیؒ، پیدائش ۱۷ھ وفات ۱۰۴ھ

حضرت علقمہؒ (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جوان تھے مگر حضورؐ سے ملے نہیں۔)

حضرت ابراہیمؒ النخعی، پیدائش ۴۶ھ وفات ۹۶ھ۔

حضرت یزیدؒ بن ابی حبیب، پیدائش ۵۳ھ وفات ۱۲۸ھ۔

ان حضرات کی تواریخ پیدائش و وفات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے صحابہؓ کے عہد کا بہت بڑا حصہ دیکھا ہے، ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہوں نے صحابہؓ کے

گھروں میں اور صحابیاتؓ کی گود میں پرورش پائی ہے اور بعض وہ تھے جن کی عمر کسی نہ کسی صحابیؓ کی خدمت میں بسر ہوئی ہے ان کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے بکثرت صحابہؓ سے مل کر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپؐ کے ارشادات اور فیصلوں کے متعلق وسیع واقفیت بہم پہونچائی ہے اس وجہ سے روایت حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ انہی لوگوں سے بعد کی نسلوں کو پہنچا ہے۔

اس کے بعد اصاغر تابعین اور تبع تابعین کا وہ گروہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ہزار ہا کی تعداد میں تمام دنیائے اسلام میں پھیلا ہوا تھا، ان لوگوں نے بہت بڑے پیمانہ پر تابعین سے احادیث لیں، اور دور دور کے سفر کر کے ایک ایک علاقہ کے صحابہؓ اور اُن کے شاگردوں کا علم جمع کیا، اُن کی چند نمایاں شخصیتیں یہ ہیں۔

حضرت جعفر بن محمد بن علی (جعفر الصادقؒ) پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۴۸ھ۔

حضرت ابوحنیفۃ النعمان (امام اعظمؒ) پیدائش ۸۰ھ، وفات ۱۵۰ھ۔

حضرت شعبہؒ بن الحجاج، پیدائش ۸۳ھ، وفات ۱۶۰ھ۔

حضرت لیثؒ بن سعد، پیدائش ۹۳ھ، وفات ۱۹۵ھ۔

حضرت ربیعۃ الرائےؒ (استاد امام مالکؒ) وفات ۱۳۶ھ۔

حضرت سعیدؒ بن ابی عروبہ وفات ۱۵۶ھ۔

حضرت مسعر بن کدام وفات ۱۵۲ھ۔

حضرت عبدالرحمٰنؒ بن قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ ۱۶۱ھ۔

حضرت سفیان الثوریؒ پیدائش ۹۷ھ وفات ۱۶۱ھ۔

حضرت حمادؒ بن زید پیدائش ۹۸ھ وفات ۱۷۹ھ۔

دوسری صدی ہجری کے جامعین حدیث: یہی دور تھا جس میں حدیث کے مجموعے لکھنے اور مرتب کرنے کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا، اس زمانہ میں جن لوگوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے، وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت ربیع بن صبیح، (وفات ۱۶۰ھ) حضرت سعید بن ابی عروبہ وفات (۱۵۶ھ) انہوں نے فقہی عنوان پر الگ الگ مسائل مرتب کیے۔

حضرت موسیٰ بن عقبہ، وفات ۱۴۱ھ، انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غزوات کی تاریخ مرتب کی۔

حضرت امام مالکؒ، پیدائش ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ انہوں نے احکام شرع کے متعلق احادیث وآثار کو جمع کیا۔

حضرت ابنؒ جریج پیدائش ۸۵ھ وفات ۱۵۰ھ انہوں نے بھی احکام شرع کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

حضرت امام اوزاعیؒ، پیدائش ۸۸ھ وفات ۱۵۸ھ انہوں نے بھی احکام شرع کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

مندرجہ ذیل حضرات نے بھی احکام شرع کے متعلق احادیث وآثار جمع کیے ہیں۔

حضرت سفیانؒ ثوری پیدائش ۹۷ھ وفات ۱۶۱ھ۔

حضرت حمادؒ بن مسلمہ بن دینار پیدائش ۹۷ھ وفات ۱۶۷ھ۔

حضرت امام ابو یوسفؒ پیدائش ۱۱۳ھ وفات ۱۸۳ھ۔

حضرت امام محمدؒ پیدائش ۱۳۱ھ وفات ۱۸۹ھ۔

حضرت محمدؒ بن اسحٰق وفات ۱۵۱ھ۔ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک مرتب کی۔

حضرت ابن سعد، پیدائش ۱۶۸ھ وفات ۲۳۰ھ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہؓ وتابعین کے حالات جمع کیے۔

حضرت عبدؒ اللہ بن موسیٰ السلمی پیدائش ۲۱۳ھ انہوں نے ایک ایک صحابیؓ کی روایات الگ الگ جمع کیے۔

حضرت مسدد بن مرحد البصریؒ، وفات ۲۱۸ھ انہوں نے بھی ایک ایک صحابیؓ کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

حضرت اسدؒ بن موسیٰ وفات ۲۱۲ھ انہوں نے بھی ایک ایک صحابیؓ کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

حضرت نعیمؒ بن حماد الخزاعی، وفات ۲۲۸ھ انہوں نے بھی ایک ایک صحابیؓ کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل، پیدائش ۱۶۴ھ، وفات ۲۴۱ھ انہوں نے بھی ایک ایک صحابیؓ کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

حضرت اسحٰقؒ بن راہویہ پیدائش ۱۶۱ھ وفات ۲۳۹ھ انہوں نے بھی ایک ایک صحابیؓ کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

حضرت ابوبکرؒ بن ابی شیبہ، پیدائش ۱۵۹ھ، وفات ۲۳۵ھ انہوں نے فقہی ابواب اور صحابہؓ کی جداگانہ مرویات، دونوں کے لحاظ سے احادیث جمع کیں۔

ان میں سے امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، محمدؒ بن اسحٰق، ابنؒ سعد، امام احمدؒ بن حنبل اور ابوبکرؒ بن ابی شیبہ کی کتابیں آج تک موجود ہیں اور شائع ہو چکی ہیں، نیز موسیٰؒ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک حصہ بھی شائع ہو چکا ہے اور جن حضرات کی کتابیں آج نہیں ملتیں وہ بھی درحقیقت ضائع نہیں ہوئی ہیں بلکہ اُن کا پورا مواد بخاری ومسلم اور اُن کے ہمعصروں نے اور اُن کے بعد آنے

والوں نے اپنی کتابوں میں شامل کرلیا۔ اس لیے لوگ ان سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔

احادیث کے محفوظ رہنے کی اصل وجہ: صحابہؓ کے لیے خاص طور پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھنے اور انہیں صحیح صحیح بیان کرنے کے کچھ مزید محرکات بھی تھے جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) وہ سچے دل سے آپ ؐ کو خدا کا آخری نبی اور دنیا کا سب سے بڑا انسان سمجھتے تھے، ان کے دل پر آپ ؐ کی شخصیت عام انسانی شخصیتوں جیسی نہ تھی کہ وہ اُن کو معمولی حافظہ کے حوالے کردیتے۔ اُن کے لیے تو ایک ایک لمحہ جو انہوں نے آپ ؐ کی معیت میں گذارا، اُن کی زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ تھا اور اُس کی یاد کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔

(۲) وہ آپ ؐ کی ایک ایک تقریر، ایک ایک گفتگو اور آپ ؐ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کررہے تھے، جو انہیں اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھا۔ وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے سخت جاہل اور گمراہ تھے، اور یہ پاکیزہ ترین انسان ؐ اب ہم کو صحیح علم دے رہا ہے اور مہذب انسان کی طرح جینا سکھا رہا ہے، اس لیے وہ پوری توجہ کے ساتھ ہر بات سنتے اور ہر فعل کو دیکھتے تھے کیوں کہ انہیں اپنی زندگی میں عملاً اسی کا نقش پیش کرنا تھا، اُس کی نقل اُتارنی تھی اور اُس کی رہنمائی میں کام کرنا تھا، ظاہر ہے کہ اس شعور واحساس کے ساتھ آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اور سُنتا ہے اُسے یاد رکھنے میں وہ اتنا سہل انگار نہیں ہوسکتا، جتنا وہ کسی میلہ یا کسی بازار میں سُنی اور دیکھی ہوئی باتیں یاد رکھنے میں ہوسکتا ہے۔

(۳) وہ قرآن کی رو سے یہ بھی جانتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی اُن کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ خدا کے نبی ؐ پر افتراء کرنا بہت بڑا گناہ ہے، جس کی سزا ابدی جہنم ہوگی، اس بناء پر وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب

کر کے کوئی بات بیان کرنے میں سخت محتاط تھے۔ صحابہ کرامؓ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی صحابیؓ نے اپنی کسی ذاتی غرض سے یا اپنا کوئی کام نکالنے کے لیے حضور ؐ کے نام سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھایا ہو۔ حتیٰ کہ اُن کے درمیان جب اختلاف برپا ہوئے اور خوں رَیز لڑائیاں تک ہوگئیں، اس وقت بھی فریقین میں سے کسی ایک شخص نے بھی کوئی ایک حدیث گھڑ کر دوسرے کے خلاف استعمال نہیں کی۔ اس قسم کی حدیثیں بعد کے ناخدا ترس لوگوں نے تو ضرور تصنیف کیں، مگر صحابہؓ کے واقعات میں اس کی مثال ناپید ہے۔

(۴) وہ اپنی ذات پر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات اور آپ ؐ کی ہدایات وتعلیمات بالکل صحیح صورت میں پہونچائیں اور اس میں کسی قسم کا مبالغہ یا آمیزش نہ کریں، کیوں کہ اُن کے نزدیک یہ دین تھا اور اس میں اپنی طرف سے تغیر کردینا کوئی معمولی جرم نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم خیانت ہے اسی وجہ سے صحابہؓ کے حالات میں اس قسم کے بکثرت واقعات ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے وہ کانپ جاتے تھے، اُن کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا تھا جہاں ذرہ برابر بھی خدشہ ہوتا تھا کہ شاید حضور ؐ کے الفاظ کچھ اور ہوں وہاں بات نقل کرکے "او کما قال" کہہ دیتے تھے تا کہ سننے والا اُن کے الفاظ بعینہٖ حضور ؐ کے الفاظ نہ سمجھ لے۔

(۵) اکابر صحابہؓ خاص طور پر عام صحابہؓ کو احادیث روایت کرنے میں احتیاط کی تلقین کرتے رہتے تھے، اس معاملہ میں سہل انگاری برتنے سے شدت کے ساتھ روکتے تھے اور بعض اوقات اُن سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد سُن کر شہادت طلب کرتے تھے تا کہ یہ اطمینان ہوجائے کہ دوسروں نے بھی یہ بات سنی ہے، اس اطمینان کے لیے صحابہؓ نے ایک دوسرے کے حافظہ کا امتحان بھی لیا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عائشہ کو حج کے موقع پر حضرت عبداللہؓ

بن عمرؓو بن عاص سے ایک حدیث پہونچی، دوسرے سال حج میں اُم المومنینؓ نے پھر اُسی حدیث کے دریافت کرنے کے لیے اُن کے پاس آدمی بھیجا، دونوں مرتبہ حضرت عبداللہؓ کے بیان میں ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کے" واقعی عبداللہ کو بات ٹھیک یاد ہے"۔ (بخاری مسلم)

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات وتعلیمات کا بہت بڑا وجود تھا، جس کی حیثیت محض زبانی روایات ہی کی نہ تھی بلکہ صحابہؓ کے معاشرہ میں اُن کی شخصی زندگیوں میں، اُن کے گھروں میں ،اُن کی معیشت اور حکومت وعدالت میں اُس کا پورا ٹھپہ لگا ہوا تھا، جس کے آثار ونقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے، ایسی ایک چیز کے متعلق کوئی شخص حافظہ کی غلطی یا اپنے ذاتی خیالات وتعصبات کی بناء پر کوئی نرالی بات لاکر پیش کرتا بھی تو وہ چل کہاں سکتی تھی ،یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نرالی حدیث آئی بھی ہے تو وہ الگ پہچان لی گئی ہے اور محدثین نے اُس کی نشاندہی کردی ہے کہ اس خاص راوی کے سوا یہ بات کسی اور نے بیان نہیں کی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

آستانہ دہلی دسمبر ۱۹۶۳ء

☆☆☆

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار ورسن را

حضرت سرمدؒ شہید رحمۃ اللہ علیہ

آنا نکہ غم تو برگزید ند ہمہ
در کوئے شہادت آرمید ند ہمہ
در معرکہء دوکون فتح از عشق است
با آنکہ سپاہِ او شہید ند ہمہ!

عہد عالمگیری اور اس کے بعد جس قدر تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں بالعموم سرمدؒ کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں اُن کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافہ کے لیے پورا پتہ بھی میسر نہ آتا اور پھر جو کچھ ہوں تو دقت یہ ہے کہ اس وقت سامنے نہیں، میں نے عہدِ عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث وواقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولٹیکل عاقبت اندیشوں نے قلم کو روک لیا تھا، مرزا محمد کاظم نے عالمگیر کے حکم سے تمام سوانح وحالات بقید سنین قلم بند کرنے شروع کیے لیکن صرف دس سال ہی کے حالات لکھے تھے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کردیا گیا۔ اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ خاں کو خیالِ تکمیل ہوا، اُس کے اشارہ سے مستعد خاں نے بقیہ چالیس سال کے سوانح قلم بند کیے اور ابتدائی دہ سالہ مجموعہ کا انتخاب شامل کر کے" مآثرِ عالمگیری" نام رکھا، میں نے ۱۰۷۰ھ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمدؒ کی شہادت کا سن ہے مگر حالات کا ملنا

ایک طرف، معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہید عشق کے جامۂ خونچکاں کی قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھبے نہ پڑ جائیں لطف یہ کہ اسی سال شاہ عباس ثانی اور حسین پاشاہ رومی (غالباً والی حجاز) کے سفراء آئے تھے، اُن کے حالات کی سطریں صفحہ کی انتہا تک پہنچ کر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رُکتیں، خیر یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے، طرۂ بریں یہ کہ اس سال نواحِ دہلی میں کہیں چند لڑکے شاہ و وزیر کی نقل کھیل رہے تھے، اُن میں ایک کوتوال اور ایک مجرم بھی تھا، مصنوعی کوتوال نے غیض وغصہ میں آکر مصنوعی مجرم کو اصلی سزا دی، نصف صفحہ کے قریب اس حادثۂ عظیم اور داستانِ اہم کی نذر کیا گیا۔ مورخ کی نظر کا جب یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے قصوں کے ہجوم میں سرمدؒ کی نعش کیوں کر نظر آتی؟

خافی خاں کی ''منتخب اللباب'' عہد مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے، جس نے اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں کہ گویا صرف یہی زمانہ موضوعِ کتاب ہے، قیاس کہتا ہے کہ اس نے یہ واقعہ نظرانداز نہ کردیا ہوگا، کیوں کہ عالمگیری عہد کا قلم اُس کے ہاتھ میں نہ تھا جس کو ہر قدم پر روک لیے جانے کا اندیشہ ہو، مگر جب اُسے کھولا تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرمدؒ کے متعلق نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا راز مورخ کا قلم ہے، آج کون کہہ سکتا ہے کہ اُس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئیں تھیں۔

سرمدؒ کی شہادت کا وہی سَن ہے جس سَن میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کی گئی اس لیے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصہ اسی فتح یابی کی داستان سرائی میں صرف کر دیا۔ فتح آسام کی اہمیت بیان میں شک نہیں۔ مگر مستعد خاں کو کیا معلوم کہ تماشا گاہِ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس شادیانی فتح پر تو غلط انداز نظر نہ ڈالیں گی مگر اس غم اثر شکست پر ہمیشہ خونچکاں رہیں گی...... جو ایک مجنون لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچ کر معرکۂ حق پرستی میں عالمگیر کو نصیب ہوئی۔

قصہ مختصر آباایں ہمہ دو کتابیں ایسی پیش نظر ہیں جن سے زیادہ تر معتبر راوی سرمدؒ کے لیے نہیں ہو سکتے، پہلا شخص شیر خاں لودھی (مصنف مرآۃ الخیال) ہے جو بغیر کسی واسطہ کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے۔ کیوں کہ اسی عہد کا تذکرہ نویس ہے۔ دوسرا شخص علی قلی خاں داغستانی محمد شاہ کے امراء میں سے ہے، جس نے نہایت تفحص اور احتیاط سے شعراءِ فارسی کا تذکرہ ''ریاض الشعراء'' مرتب کیا۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے اور زیادہ تر حالات میں نے اُسی سے لیے ہیں، یہ گو عہد محمد شاہ میں لکھا گیا ہے لیکن سرمدؒ کے حالات کے لیے ایک واسطہ سے زیادہ دور نہیں۔ اس کے علاوہ تمام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے ذہن میں کچھ نہ کچھ تو محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک بیاضِ قلمی عہد عالمگیر ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین، سراؔج کی جمع کی ہوئی موجود ہے۔ اس میں کہیں کہیں حالات بھی دیے ہیں۔ چند باتیں اس سے جمع کی ہیں، غرض یہ کہ گلدستہ تو بنا مگر چند پتوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے لیا کہ مشہد سرمدؒ میں جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔

سرمدؒ کی اصل قومیت اور مذہب کو کوئی صاف نہیں بتلاتا، مصنف ''مراۃ الخیال'' کا بیان ہے کہ ''اصلش از فرنگستان وارمنی بود'' مگر باقی تذکرے یہودی الاصل بتلاتے ہیں، والہ داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کاشان تھا۔ مگر یہ اختلاف باہم متناقض نہیں ہے۔ کیوں کہ ایران میں قدیم سے ارمنیوں کی وسیع آبادی موجود ہے۔ جو بالعموم مسیحی اور بعض بعض یہودی ہیں۔ اب تو انہوں نے یکسر یورپین طرز معاشرت اختیار کرلی ہے اور تحصیل علوم جدید میں تمام ایرانی جماعتوں کے پیشرو ہیں۔ مگر ایک صدی پیشتر تک ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں سے مختلف نہ تھی۔ اُن میں سے بعض اسلامی علوم وآداب کو اس حد تک حاصل کرتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ صحبتوں میں شریک ہو سکتے تھے۔ چناں چہ تذکروں میں متعدد شعراء کے حالات ملتے ہیں جو ارمنی اور مسیحی تھے مگر

ان کے اشعار ایران کے مسلمان خوشگوار شعراء کے کلام سے کسی طرح کم نہیں سرمدؒ کا خاندان بھی ارمنی اور یہودی ہوگا۔ کاشان میں متوطن ہوں گے۔ ارمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو خیال پیدا ہوا ہوگا کہ فرنگی ہے اور ایک باہر کے غیر معروف آدمی کی نسبت ایسا دھوکا ہونا کچھ عجیب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈھتا کہ اپنی کرنوں کا انہیں نشیمن بناؤں۔ اس کا فیضان ضوبخش مبدأ فیاض کی طرح فیض عام رکھتا ہے۔ محل سرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضوء فشانی سے چمک اٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں پر سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میرا مقصد نظام شمسی کے مرکز سے نہیں، بلکہ آفتاب اسلام سے ہے۔ جب اس کی تجلی کی لہریں اُٹھیں تو انہوں نے پہلے تو جسم، خون اور قوم و مرز بوم کے قائم کیے ہوئے امتیازات کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ پھر سیرابی کا وقت آیا تو احرار قریش اور ارقائے حبش، بطحا و یثرب اور عجم و فرنگ، تاجدار غسان اور بادیہ نشین عرب، ادنیٰ و اعلیٰ، دور نزدیک سب کو یکساں طور پر شریک فیض کیا۔ صرف صلاحیت اور اثر پذیری، معیار فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدر صلاحیت حصہ یاب ہوئی۔ بوجہل قریشی تھا اور خزانہ کے پاس، مگر مدت العمر محروم رہا۔ بلال حبشی اور صہیبؓ رومی تھے اور کس قدر دور، مگر ان کے دامن دیکھئے تو مالا مال تھے۔ ابرِ کرم کہاں نہیں برستا؟ مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبدا و منشاء اسلام تھا مگر اس کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔ نومسلم قومیں جو دور دراز ملکوں سے آئی تھیں ہر علم و فن میں اس طرح یگانۂ روزگار ہوئیں کہ خود عرب کو اُن کے لیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں۔ یہاں تک کہ آج تراجم و رجال کی کتابیں اٹھا

کر دیکھتے ہیں تو کوئی علم و فن ایسا نظر نہیں آتا جس پر نومسلم قوموں کا تسلط نہ ہو حتیٰ کہ فقر و تصوف، جس کی مذہب کے تالے میں پرورش ہوتی ہے۔ اس کی تاریخ بھی نومسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں۔ بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس طرح عام تھی کہ نسب و قومیت کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا۔ محرم کی سبیلیں جب لگائی جاتی ہیں تو پیاسوں کی تلاش ہوتی ہے۔ زرّیں کلاہوں اور ریشمی قباؤں پر نظر نہیں پڑتی۔ سرچشمہ فیضانِ الٰہی بھی تشنگانِ محبت کو ڈھونڈھتا ہے۔ نَسب و قومیت اور رنگ و خاندان سے اُسے کیا سروکار؟

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمدؒ کی سوانح عمری بھی ہے وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مذہباً یہودی یا مسیحی تھے آغاز عمر ہی میں فیضانِ الٰہی کی نظر انتخاب پڑی اور جذبِ ہدایت کی کشش نے مشرف بہ اسلام کیا۔ خاندانی نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا۔ عام طور پر صرف ''سرمدؒ'' ہی کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے اور سچ یہ ہے کہ سرمدؒ کا بے نام ہونا جائے تعجب نہیں کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام و نشان رہنا تو رکن اولیں بلکہ شرطِ ایمان ہے۔

باوجودم، ز من آواز نیامد کہ منم

لیکن بعض تذکروں میں ''سعید سرمدؒ'' کے عنوان سے ان کے حالات درج کیے گئے ہیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک جز شاید لفظ سعید ہوگا جو بقاعدۂ تخفیف، تخلص کے ساتھ مشہور ہو گیا۔ تحصیل علم کا حال معلوم نہیں۔ لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل اور عربیت میں درجہ کمال رکھتے تھے، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علم اس زمانہ کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ایران سے تجارتی اموال لے کر ہندوستان کی طرف بڑھے کہ

اس زمانہ میں علم وفن کی طرح جنس ومتاع کی نمائش گاہ بھی ہندوستان تھا۔ مگر یہ جوان تاجر جو بے خبر ہندوستان کی طرف قدم راں تھا نہیں جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر کس تجارت میں اسے اپنا تمام سرمایہ لگا دینا پڑے گا۔ وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کر کے ہندوستان کی قیمتی اجناس اور محسودِ عالم کانوں کے لعل والماس خریدنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ قضا وقدر اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے۔ تجارت تو انہیں بہرصورت آخرِ حیات تک کرنی پڑی مگر مادی زخارف کی تجارت گاہوں میں نہیں۔ بازارِ حسن وعشق میں جہاں چاندی سونے کی جگہ دل صد پارہ اور جگر صد زخم خوردہ کا سکہ رائج ہے اور جہاں کی تجارت یہ ہے کہ صبر وشکیب، ہوش وخرد، دل وجگر دے کر ایک غلط انداز نظر، ایک چین جبیں، ایک تغافل پیشہ نگاہ خرید لیجیے کہ اس سہل قیمت پر یہ متاع مشکل مفت ہے۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

اس زمانہ میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے۔ سندھ کے شہروں میں ٹھٹھ ایک مشہور شہر تھا، جس کو اب نئے جغرافیہ گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے، یہی ٹھٹھ وہ سینائے مقدس تھا، جو سرمدؔ کے لیے تجلی گاہ ایمن بنا اور لیلائے حسن نے اول اول اپنے چہرہ سے نقاب الٹی، کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا جس کی چشم کافر نے یہ افسوں طرازی کی، اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ کیوں کہ عشق خیز دلوں کو دو نیم کرنے میں نجیہ گر کی سُوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں۔ یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پرواہ وبے نیاز، مگر صاحب جنس غرض مند ہوتا ہے، پھر جو لوگ کہ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرز نظر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈھتے ہوں، اُنہیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاعِ دل کی کسمپرسی سے تنگ آ گیا تھا اور خود خریدار کو بے تابانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا

لے کے آیا ہے؟ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاعِ ارزاں کی ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کر لیا۔

دلاّل عشق بود وخریدار جانستاں
خود را فروختیم، چہ سودا بما رسید

سرمدؔ کو آئندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا اور کچھ سرمدؔ ہی کی خصوصیت نہیں۔ عشق خواہ کسی عنوان سے ہو منزل حقیقت کا ہمیشہ سے پہلا قدم ہے، بلکہ یہ کہنا بھی تنزل ہے منزل حقیقت کا کیا ذکر۔ عشق تو وہ دروازہ ہے جس سے گزرے بغیر انسان، انسان نہیں ہو سکتا، جس کے دل وجگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں، اس کو معنی انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہد معتکف بھی باایں ہمہ تعبّس وتقشّف، جب اپنے زاویہ عبادت میں سر بہ زانو ہوتا ہے تو حور وغلمان کی مسکراہٹ لیے بغیر نہیں رہ سکتا، یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈھتے ہیں انہیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں۔

حور وجنت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سوداز دگانِ حقیقت، شاہد ازلی کے جاں دادہ ہیں انہیں بھی عشقِ مجازی کے کوچوں میں در و دیوار سے ٹکراتے دیکھا گیا ہے، کیوں کہ دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کا ایک ٹکڑا ہے جس کو پانی بنتے دیکھا ہے، مگر برف آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی حالاں کہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز وگداز ہے اور عشق کا کلسیا آتش کدہ ہے۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتش کدہ پر نذر چڑھا دیں اور پھر دامن سے ہوا بھی دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے۔

افسردہ را نصیب نباشد دل کباب

آں باید ایں نوالہ کہ مہمان آتش است

عشقِ الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا سے آنکھیں بند کر لی جائیں مگر انسان آب و گل کے تعلقات میں اس طرح پابہ گل ہے کہ جب تک دل پر درد کو کوئی محکم چوٹ نہ لگے اُدھر سے ٹوٹ نہیں سکتا، مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اڑا یئے نہیں، نہیں اُڑتی۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دلفریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی درد کے لیے عارفِ عطارؒ بیقرارانہ فغان ساز ہے۔

کفر کافر را و دیں دیندار را

ذرّہ دردے دلِ عطارؒ را

غور کرو، جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے کے تصور میں اپنے خرمنِ ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے۔ اس کو شائد حقیقت کا نظارہ حواسِ ظاہری سے کب ہو سکتا ہے؟ جس افسردہ نفس نے اپنی عزیز اور شیریں راتیں کسی نرگسِ خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں۔ اس کو معشوقِ حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہوں گی؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایہ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو۔ وہ خود پسندی اور وجود آرائی کے بُت کو کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے حس کو کسی پیکرِ حُسن کی صدائے شیریں نے مبہوت اور لایعقل نہ کر دیا ہو اس کو سازِ ازلی کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے گا؟ غرض کہ جس بدنصیب کو کسی

مستِ حُسن کی نگاہِ بے محابا بے خود نہ کر سکی ہو اُسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے، لیکن نئے فتیلے کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے۔

محبت با دلِ غم دیدہ الفت بیشتر گیرد

چراغے را کہ دودے ہست آتش زود تر گیرد

نظریں اگر جویائے حُسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر رہیں انہیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی ہی پر لوٹ جانا چاہیے۔ یعقوبؑ کی گم کردہ پسر آنکھوں نے جلوۂ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہنِ یوسفی کی بو پاتے ہی کھل گئیں۔ کہ اِنِّی لَاَ جِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ یہی وجہ ہے کہ میخانۂ حقیقت میں جب مجلس گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دور چلتا ہے اور جب اس کے تلخ گھونٹ گوارا ہو جاتے ہیں تو پھر خود ساقی اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے کہ اب جام و سبو کی ضرورت نہیں۔ اس کی نگاہِ نشہ خیز سے خود رفتگی و خود گذشتگی حاصل کیجیے۔

مئے حاجتے نیست سیتم را

درچشم تو تا خمار باشد

سرمدؒ کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا، جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی رعنائی پر منحصر ہے اس لیے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے جس کی نگاہِ لیلیٰ وش نے سرمدؒ کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس و فرہاد کی قسمت کہاں سے لائے! سرمدؒ کے لیے لیلیٰ کا زیادہ سے زیادہ حال جو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجیے تو یہ بھی بہت ہے۔ کیوں کہ بازارِ عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت مل رہی ہے؟

مر افروخت محبت ولے نمی دانم

کہ مشتری چہ کس ست و بہائے ما چند است

اربابِ تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا، والہ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت میں، آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرہ میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے لیکن ان سب میں مراۃ الخیال قدیم العہد ہے اور اس کا بیان ہے کہ ''دراثنائے تجارت بشہر تتہ افتادہ بر ہندو پسرے عاشق گشت'' اس لیے ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے بہر کیف بجلی کہیں گری ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمنِ سوختہ کا کیا حال ہوا؟

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں، ہر عاشق گو قیس نہ ہو مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آتا ہے تو عقل وحواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کردو۔ سرمدؒ پر یہی حالت طاری ہوئی اور جذب وجنوں اس طرح چھایا کہ ہوش وحواس کے ساتھ تمام مال ومتاع تجارت بھی غارت کردیا۔ دینوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی۔ بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا ہوگیا کہ یہ پابندیاں تو مدعیانِ ہوشیاری کے لیے ہیں۔ مجنوں، لایعقل، مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

خطا بمردمِ دیوانہ کس نمی گیرد

جنوں نداری وآشفتۂ خطا ایں جاست

بیابان نوردی، عالم عشق کی سیر وسیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے۔ ''مجنوں'' جو صفِ عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی اس کا حریف نہیں، سرمدؒ نے بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی۔ سندھ کے ریگ زاروں سے تلوئے گرم کیے۔ ہندوستان کے گرم وسرد موسموں کو یکساں عُریانی میں کاٹ دیا اور بالآخر جب یہ عقدہ کُھلا

بیہودہ چسرا اور طلبش می گردی

بنشیں! اگر او خدا است خود می آید سرمدؒ

پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے، لیکن

جب نتیجہ یہی تھا تو پھر یہ بیاباں نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں، میں خود ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانونِ کمال میں داخل ہے اور عشق کے قانون میں استثنا نہیں۔

یکے از دستگیر یہائے عشق است

عزیزاں رانجوا ہی برکشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساط ہند پر عالمگیر ایک نئی چال چلنے والا تھا، یہ شاہجہانی حکومت کا عہد آخر تھا، شہزادہ داراشکوہ ولیعہد سلطنت تھا، سلسلہ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گذرا ہے۔ اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے ظلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اس لیے اصلی تصویر..... سیاسی چالوں کے گرد وغبار میں چھپ گئی وہ ابتداء سے درویش دوست اور صوفیانہ دل ودماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقراء اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست بردِ حوادث سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا خود بھی ذوق وکیفیت سے خالی نہیں۔

اس کے صاحبِ ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاشِ مقصد میں اس نے دیر وحرم کی تمیز اٹھادی تھی اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے وہ سر جھکاتا تھا۔ ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ بھی رکھتا تھا، اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کرسکتا ہے۔ کیوں کہ اگر اس عالم میں بھی کفر واسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا؟ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیے۔ اگر وہ صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر

پروانہ چراغِ حرم و دیرنداند

سرمدؒ جوشِ جنوں میں پھرتے ہوئے جب شاہجہاں آباد دہلی پہونچے تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لیے جائیں۔ کیوں کہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی میخانہ میں ملے گا۔ مصنف مراۃ

الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صفِ اولیں کا طالب ہے لکھتا ہے ''چوں خاطر سلطان داراشکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بوے درگرفت۔'' بیچارہ علی شیرا بھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سر مار رہا ہے۔ اُسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پلے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلّہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا۔ اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش وحواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرۂ جنون مل سکتا ہو تو بازار یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔ بہر کیف خواہ کچھ ہو عالمگیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں داراشکوہ کی دیوانگی اور جنوں دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگانِ حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کے رگ ہائے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ شاید داراشکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آ گیا تھا۔ اسی لیے اس نے سرمدؒ جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرض یہ کہ سرمدؒ، داراشکوہ کی صحبت میں رہنے لگے اور اُسے بھی سرمدؒ سے کمالِ عقیدت تھی۔ اس زمانہ میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اُنہیں باہر نکلنے پر مجبور کرتیں۔ لیکن چوں کہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے۔ اس لیے شاہجہاں آباد سے نکل نہیں سکتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور داراشکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا اور ایک عرصہ کی شورش وخونریزی کے بعد ۱۰۶۹ء میں عالمگیر اورنگ نشین حکومت ہوا۔ یہ زمانہ، داراشکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لیے خود داراشکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو داراشکوہ کے ساتھ نکل گئے اور جو رہ گئے انہوں نے اپنے آپ کو کشتی طوفان میں پایا لیکن اس رہنِ بے خبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دنیا کو نظر اُٹھا کے دیکھے اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا، کیوں کہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی

ابتدائی منزلیں تھیں۔ آخری منزل طے کرنی باقی ہے اور یہیں پیش آنے والی ہے۔

بیکد وزخم کہ خوردن نہ عشق ایمن مباش

کہ در کمیں گہِ ابرو کمانکش است ہنوز

سرمدؒ کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں، مراۃ الخیال میں ہے کہ سرمدؒ کی اس رباعی پر جُبہ پوشانِ شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے اُسے کفر قرار دیا۔ کہ معراجِ جسمانی سے انکار لازم آتا ہے۔

ہر کس کہ سرِ حقیقتش یاد رشد

اور پہن تر از سپہر پہناد رشد

مُلا گوید کہ بر فلک شد احمد

سرمدؒ گوید فلک براحمدؐ در شد

مگر اس تُرکِ سادہ کو فقیہانہ جنگ وجدل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور وغوغا کر رہے ہیں؟ وہ تو اس عالم میں تھا جہاں ان اقرار وانکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہونچ سکتی۔

در عجائب ہائے طور عشق حکمتہا کم است

عقل را با مصلحت اندیشی مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمدؒ کا سب سے بڑا جرم، داراشکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانہ اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے سیاست، مذہب کی آڑ میں رہی ہے۔ اور ہزاروں خونریزیاں سیاسی اسباب سے ہوئی ہیں۔ انہیں مذہب ہی کی چادر اوڑھا کر چھپایا گیا ہے جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عریانی وبرہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیا اور مذکورہ

بالا رُباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کے منکر ہیں۔ مُلا قوی اس زمانہ میں قاضی القضات تھے، عالمگیر نے انہیں سرمدؒ کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں، مُلا صاحب نے کہا ''باوجود کمال علم وفضل برہنہ ومکشوف العورۃ رہنا کس عذر پر مبنی ہے؟ سرمدؒ نے کہا ''کیا کروں، شیطان قوی ہے'' اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل منست و من در طلبش
وزدے عجیبے برہنہ کردہ است مرا

مُلا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی۔ کیوں کہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی تھی مگر خود اُن کے وجود کی سخت اہانت ہوئی۔ یعنی ان کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا۔ بہر کیف انہوں نے عالمگیر سے آ کر کہا کفر کا کافی مواد ہاتھ آ گیا ہے'' اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علماء ظاہر کی تیغ خوں آشام اسی نیام میں رہتی ہے لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشوں نے صرف اس بہانہ کو کافی نہ سمجھا، وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمدؒ کوئی معمولی شخص نہیں ہے جس کا قتل ایک عامتہ الورود واقعہ سمجھا جائے گا۔ علم وفضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں ہے اور رجوع خلائق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہاں آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے اس لیے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے اس ارادہ کو ملتوی رکھنا چاہیے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہاء کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون اُن کے فتووں کا دامن گیر ہے اسلام کی تاریخ کو خواہ کہیں سے پڑھو، سینکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ بادشاہ جب خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتاء کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے، صوفیاء اور ارباب باطن پر منحصر نہیں۔ علماء شریعت میں سے بھی جو نکتہ بیں ہوئے

تو فقہاء کے ہاتھوں انہیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور بالآخر سر دے کر نجات پائی۔ سرمدؒ بھی اسی تیغ کے شہید ہیں

چوں میرو نظیریؔ خونیں کفن بحشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں داد خواہ کیست

آخر الامر یہ پایا کہ سرمدؒ کو علماء وفضلاءِ عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے اور تمام علماء کی جو رائے قائم ہو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے چناں چہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمدؒ کو بلایا گیا، سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا اور پوچھا ''لوگ کہتے ہیں کہ سرمدؒ نے داراشکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟'' سرمدؒ نے کہا ''ہاں اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اُسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی''۔

عمامہ بندوں نے کہا کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے اور اس کے لیے صاحب عقل وتمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں، اس کا جواب تو سرمدؒ پہلے ہی دے چکے تھے۔

وزدے عجیبے برہنہ کردہ است مرا

خلیفہ ابراہیم بدخشانیؒ آخرِ عہد عالمگیری میں ایک صاحب طریقت بزرگ گزرے ہیں جو ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے اور فتح اللہ خاں کے ہاں کہ امراء عالمگیری میں سے تھا نوکر ہو گئے تھے۔ اتفاقاً میر جلال الدین بدخشانیؒ ایک صاحب حال بزرگ کی ان پر نظر پڑ گئی اور ان کو فیض پذیر دیکھ کر اپنی تربیت میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی صاحب حال ہو گئے، علم ظاہری کی تحصیل کا گو موقع نہ ملا۔ لیکن مذاق فطری کا یہ حال تھا کہ مثنوی معنوی کا دفترِ ہفتم چار حصوں میں نظم کیا۔ جو درد و کیف سے لبریز ہے۔ معزالدین جہاندار شاہ کو اُن کی خدمت میں کمال اعتقاد تھا اور ہندوستان و دکن میں ہزاروں اشخاص اُن کے معتقد وحلقہ بگوش تھے۔ والہ داغستانی انہیں بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ

جب مجمع عُلماء میں سرمدؒ کو لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور مسموع نہ ہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہوسکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے"۔ اور یہ اس لیے کہا کہ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمدؒ کی عاداتِ عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیّبہ جب پڑھتے ہیں تو لا اِلٰہ سے زیادہ نہیں کہتے، علماء نے سرمدؒ سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لا الٰہ پڑھا کہ جملہ نفی ہے۔ اس پر علماء نے شور مچایا تو کہا۔

"ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں، مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر "الا اللہ" کہوں گا تو جھوٹ ہوگا اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟ علماء نے کہا ایسا کہنا کفرِ صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمدؒ اس سے بہت اونچے ہیں کہ انہیں کفر وایمان کی صحبتیں سنائی جائیں اور وہ قتل وخون کے احکام سے مرعوب ہوں۔ کفر ساز تو اپنے مدرسہ ومسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں کفر وایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔

کشورے ہست کہ در دے رود از کفر

ہمہ جا گفت وشنو بر سر ایماں نر دد

اور سرمدؒ نے تو اپنی اصلی حالت بے کم وکاست بیان کردی تھی۔ ایمان بالغیب پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے (اور اس عدم قناعت ہی کا نام تلاش حقیقت ہے) وہ اپنے اقرار کو مشاہدہ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اور شاہد حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمدؒ کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا کہ کیوں کہ کہہ دے کہ "ہے" اس ملک کے جتنے رہرو ہیں سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن سرمدؒ کا جرم یہ تھا کہ لوگ جس جام کو چُھپ کر پیتے ہیں سرمدؒ نے اعلانیہ منھ سے لگایا اور وہ دّرۂ محتسب کے مستحق ٹھہرے۔

خرقہ پوشاں ہمہ گرمست گزشتند گزشت

قصّہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

اور نظر تعمق سے دیکھیے تو یہ اعلان ضروری تھا کیوں کہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقہ کا رخ کسی طرف ہوتا، دستِ کارفرما کا فرض تھا کہ اسی طرف پھیر دے۔

منصورؒ را کہ رخصتِ اظہار دادہ اند

غیر از قصاص ومحنت زنداں نبودہ شرط

غرض کہ جب سرمدؒ نے توبہ نہ کی علماء نے بلا تامل فتوائے قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے۔ بموجب بیانِ مراءۃ الخیال یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ میں ہوا کہ عالمگیر کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔

مو بمویم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق

یک "اناالحق" گوئے دیگر بر سر دار آورد

شاہ اسد اللہؒ، ایک مرد درویش وحق آگاہ راوی ہیں کہ مجھے سرمدؒ کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی۔ جب شورش وہنگامہ شروع ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا ایک دن موقعہ پا کر عرض کیا "اگر اپنی وضع وحالت بدل دیں تو بندگانِ الٰہی کی منت وسماجت دیکھتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں، یہ سُن کر نظر اُٹھائی اور اپنا یہ شعر پڑھ دیا۔

عمریست کہ آوازۂ منصورؒ کہن شد

من از سرِ نو جلوہ دہم دار ورسن را

جب سرمدؒ کو شہادت گاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا۔ اور اس قدر ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے۔ جہاں کا عام پسند تماشا خونریزی ہے

جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔ جب کوئی یہاں سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولھا کی سواری جارہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔

بجرمِ عشق تو ام میکشند وغوغائیست

تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سرِ بام آنے کی خواہش کی گئی، ورنہ سرمدؔ کو سر اُٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کے نظر ملائی اور کہا: ''خدائے تو شوم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ مے آئی، من ترا خوب می شناسم''

مراۃ الخیال کی روایت ہے کہ اس جملہ کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا اور مردانہ وار تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دیدی۔

شورے شدو از خوابِ عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

صاحب مراۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمدؔ کی نعشِ خون آلود پر اشک افشانی کرتا، لیکن ستم یہ ہے کہ اس پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خونریزی بھی عالمگیر کے دفترِ مناقب وفضائل میں جگہ پائے، حالاں کہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے اس کو بھی عشق ہی کی شیوہ گری سمجھیے کہ یہاں جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم وخونی ہونے کی جگہ تحسین وثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدانِ عشق بھی قربان گاہِ منیٰ ہے کہ جس قدر خون بہایئے عین ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عید قرباں

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمدؔ کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ ان کا مدفن نہیں، صرف مشہد ہے لیکن والہ داغستانی نے تصریح کردی ہے۔

''در جنبِ مسجد جامع گردن اوراز وند، ودر ہماں جا دفن کردند''

یہ مقام موجودہ مقام مزار کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں۔

راقم حروف بزیارتِ مزار دے مکرر مشرف شدہ ام، در چہار فصل سبزہ تربتش کم نمی شود۔ والحق فیضِ عجیبے در زیارت آں، منصور ثانی ہست۔''

والہ داغستانی عہد محمد شاہی میں تھا اور اس کے تذکرہ کا سالِ تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے لیکن آج بھی مشہد سرمدؔ زیارت گاہ عوام وخاص ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ... اس کے آگے رو بہ آسماں رہتے ہیں۔

برسرِ تربت حافظ چوں گزری ہمت خواہ

کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

خلیفہ ابراہیمؔ جن کے حالات اوپر گزر چکے ہیں۔ راوی ہیں کہ سرمدؔ نے زندگی میں کلمہ طیبہ لا الہٰ سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سُنا کہ سرِ کشتہ سے تین بار الا اللہ کی صدا بلند ہوئی اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمدؔ کا سر مقتول کلمہ طیبہ پڑھتا رہا اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروفِ حمدِ الہٰی بھی رہا۔

موجودہ زمانہ میں ایسی روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے۔ لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا کیوں کہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے؟ ہم نے بہار میں شگفتہ وشاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے

دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہید عشق کے سرِ مقتول کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو، ممکن ہے کہ سرمدؒ کے بے جان سر سے آواز نکلی ہو، مگر اربابِ بصیرت نے اس کی زبانِ حال کو تو ضرور متکلم دیکھا ہوگا اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے ہمارے کانوں میں تو اب تک مشہد سرمدؒ سے صدا آ رہی ہے۔

کس چہ داند قدر مردن ہائے عشق

منت ایں مرگ بر جان من است

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا اور تین سال کے بعد سرمدؒ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی، اکثر لوگوں کا خیال ہے۔

خونے کہ عشق ریز دہر گز ہدر نہ باشد

یہ سرمدؒ کے خون کی ہی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے یہاں تک کہ پیغام اجل بھی آیا تو عالم غربت و پریشانی میں، مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملہ میں معذور سمجھیں۔ تاریخ، قیاس و ظنون اور شخصی آراء کے پریشان مجموعہ کا نام ہے۔ آج چند میل کے فاصلہ پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا؟ پھر یہ بھی ہے کہ خون رفتگان عشق جب اپنے قاتلوں سے گِلہ مندِ جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ اُن کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں؟ جب سرمدؒ نے جلاد سے کہا۔ !''تو بہر صورتے کہ مے آئی من ترا خوب می شناسم۔!'' تو انہیں عالمگیر اور عالمگیری علماء سے کیا شکایت ہوگی؟ بات یہ ہے کہ دیارِ محبت میں انتقام و دعوٰی کی شنوائی نہیں اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شئے حرام نہیں ۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجیے اور ہو سکے تو اس کے

ہاتھوں کو بوسہ دیجیے۔

شدست سینۂ ظہوری پُر از محبت یار

برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

سرمدؒ کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے مگر اس وقت پیش نظر نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا مگر کئی صفحے ہو گئے اور عشق کی حکایت کب ختم ہونے والی ہے اس لیے چاہتا ہوں کہ روحِ سرمدؒ پر دستِ فاتحہ اُٹھا کر خاموش ہو جاؤں، افسوس ہے کہ یہ داستان مختصر نہ ہو سکی مگر شہیدانِ محبت کی یاد میں جتنی دیر افسردہ رہ سکیں بہتر ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

چناں کہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

آستانہ دہلی مارچ ۱۹۶۲ء

☆☆☆

مبادلۂ سنین

شادیم کہ سال نو در آمد　　　　غافل کہ ز عمر رفتہ سالے

صبح ہوئی، شام ہوئی، دن گیا، رات آئی، کل چہار شنبہ تھا، آج پنجشنبہ، کل اکتیسویں تھی، آج پہلی، کل کانوں میں اُس مہینے کی آواز آرہی تھی، آج اس مہینے کا ذکر ہے، تھوڑا زمانہ ہوا کہ دو چار، پانچ چھ مہینوں کا شمار ہو رہا تھا، سہ ماہی شش ماہی قیمت اخباروں میں بھیجی جارہی تھی، لیجیے سال تمام ہوا! ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر سب ختم! آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے اور ہمارا قلم اپنے نئے مہربان کے متعلق ایک مضمون لکھ رہا ہے! ہم ہیں کہ اس نئی صورت کو حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں: بار الٰہی! یہ نئی صورت کہاں سے وارد ہوئی؟ ابھی تو ہم اپنے گزشتہ مہمان "۱۹۰۲ء" سے دل کھول کر نہیں مل پائے تھے، خیال تھا کہ اس کی رخصت اور دوسرے کی آمد میں تین سو پینسٹھ دن (۳۶۵) باقی ہیں، مگر ابھی ہم خوابِ غفلت سے چوکنے بھی نہ پائے تھے کہ تین سو پینسٹھ دن ختم ہو گئے، اور یہ حضرت "۱۹۰۳ء" آموجود ہوئے!!

ہاں! زمانہ ایسا ہی آوارہ گرد مسافر ہے جس پر ایک منٹ کے لیے بھی بھروسہ نہیں ہو سکتا، یہ مسافر برسوں کی راہ مہینوں اور مہینوں کی راہ گھنٹوں میں طے کرتا ہے اس کی فوق العادت رفتار عجیب عجیب نیرنگیاں دکھاتی ہے مستقبل کو حال اور حال کو ماضی کر دیتی ہے، اور وہ شخص جو ان ازمنۂ ثلاثہ کو واقعی ماضی یا حال یا مستقبل سمجھے ہوئے ہو، اس انقلاب کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے!!

زمانے کا یہی حال ہے، ایک آتا ہے ایک جاتا ہے ایک پیدا ہوتا ہے ایک مرتا ہے، ہمارا پچھلا مہمان ہم سے بات کی بات میں جدا ہو گیا اور اُس کا جانشین بھی پیدا ہو گیا جو اس طرح ہم سے جدا ہو جائے گا بے شک! زمانے کی نیرنگیاں تسبیح کے دانوں کی تھیوری ہے جس کا انقلابی دور چشم زدن

میں ایک سے سو تک پہونچ جاتا ہے اور پھر نئے سرے سے شروع ہوتا ہے!!

قانون قدرت نے دنیا کا عجیب سلسلہ رکھا ہے اگر کوئی مبصر غور سے دیکھے تو اُسے نیست میں ہست اور ہست میں نیست کے کرشمے نظر آئیں گے رات اس امر کو ظاہر کر رہی ہے کہ کچھ عرصہ میں دن آنے والا ہے اور وجود کہہ رہا ہے کہ میں عدم کا پیش خیمہ ہوں صبح کے لیے شام ضروری ہے اور حیات کے لیے ممات یقینی۔

دنیا کا انقلابی سین ہمیں بتا رہا ہے کہ زمانے کی ہستی ایک پُر رونق تھیٹر سے مشابہ ہے ابھی چہار طرف ۱۹۰۲ء کے تماشے دل لبھا رہے تھے۔ کہیں جنگ چھڑی ہوئی تھی کسی طرف شادیانے بج رہے تھے کسی طرف سے ماتمی آوازیں آرہی تھیں، تماشائی ان نظر فریب تماشوں میں محو تھے کہ یکایک ڈراپ سین ہو گیا اور آن کی آن میں وہ تماشے نظروں سے چھپ گئے۔ ۱۹۰۳ء کی آمد آمد ہے اور نہایت بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے کہ دیکھیے اس اسٹیج پر کیسے کیسے ایکٹر آتے ہیں اور اپنے واقعات سے ہمیں بے چین کر کے جاتے ہیں یا مسرت شادمانی میں محو کر کے!

اگر ۱۹۰۲ء کے یادگاری واقعات پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو واقعی ایک متضاد حالت نظر آئے گی۔ اگر ایک واقعہ ہم کو خوش کرے گا تو دوسرا غمگین، گویا یہ ایک ایسی تصویر ہے جس کے دو رخ ہوں یا ایسا انسان ہے جس کی متضاد الصفات دو آنکھیں ہوں، تصویر کا ایک رخ روشن ہو تو ایک تاریک انسان کی ایک آنکھ روتی ہو تو ایک مسرت کا پتہ دیتی ہو۔ ٹرنسوال کی خوں ریز جنگ کی طوالت جزائر امریکہ اور کاشغر کی حیرت انگیز تباہیاں۔ ہندوستان کے ریلوے حادثات اور طاعون کی ترقی، نامور لوگوں کی بے وقت وفات اس سال کے غمگین واقعات کے نمونے ہیں، حضور ملک معظم قیصر ہند کا عین تاجپوشی کے زمانے میں سخت علیل ہو جانا اس سال کا سب سے اہم واقعہ ہے لیکن بفضلہٖ تھوڑے ہی زمانے میں حضور انور کا صحت یاب ہو کے جشن تاجپوشی منانا ایک مسرت خیز نعم البدل ہے

جسے گزشتہ سال کی تمام کلفتیں دور کر دیں، اور خاتمہ سال پر ہندوستان کے قدیم پایہ تخت دہلی میں تو ایسا عالیشان دربار ہوا جو آج تک چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا، دہلی کے علاوہ آج ہندوستان کے ہر خطے میں جشن تاج پوشی کا مسرت خیز سین نظر آ رہا ہے!!

مبادلۂ سنین کو ایسا مسرت ناک موقع بہت کم ملا ہوگا! دونوں سال جس خوشی سے گلے ملے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے صفحات بہت کم پیش کر سکیں گے، اگر ۲۹ دسمبر ۱۹۰۲ء جلوس شاہی کے گشت کی تاریخ تھی تو یکم جنوری ۱۹۰۳ء دربار قیصر کا مبارک دن جو عید الفطر کو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ اگر گزشتہ سال کا چہارم حصہ جشن دہلی کی تیاریوں اور اُس کی چہل پہل میں صرف ہوا تو موجودہ سال کا اس سے زیادہ حصہ اس مبارک جشن کی مسرتوں میں صرف ہوگا۔ اور اس لیے ہم دونوں سال کے قران السعدین پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں!

اس تحریر کو ختم کرنے سے پہلے ہم نہایت خوشی سے ۱۹۰۳ء کو "ویلکم" کہتے ہیں! دیکھیں ہمارا نیا دوست ہمارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی آمد سے ہم پر مسرتوں کے دروازے کھل گئے اور ہمارے "شہنشاہ عالم پناہ" کی تاج پوشی نے ہمارے دلوں کو باغ باغ کر دیا۔ ہم اس مسرت میں محو ہو رہے ہیں کہ اس مضمون کے اختتام کے لیے ہمیں ایسا مبارک موقع ہاتھ آیا ہے کہ خدنگ نظر کے اُن نامور مضمون نگاروں کی طرف سے جو اس شہنشاہ عالی جاہ کی اُردو خوان پبلک کی دلچسپیوں میں اپنے بیش بہا مضامین سے اضافہ کر رہے ہیں حضور ملک معظم دام دولتہ اور ان کے نائب السلطنت ہز ایکسیلنسی لارڈ کرزن بہادر بالقابہ کی خدمت میں مودبانہ مبارکباد پیش کر کے اس مسرت آگین موقع پر فخر کریں، اور صدق دل سے دعا کریں کہ "الٰہی ہمارے شہنشاہ کی عمر دراز ہو!"

خدنگ نظر جنوری ۱۹۰۳ء

☆☆☆

الاخلاق

تمہید

مشرق کے علوم وفنون، صنائع وتجارت، معاشرت وسیاست، مختصراً یہ کہ تمام مظاہر زندگی اصلاح طلب ہیں اس لیے یہ صحیح ہے کہ مشرق کو کسی اصلاح سے استغنا نہیں لیکن یہ ایک نا قابل انکار صداقت ہے، کہ قوم میں مذہبی سیاسی اجتماعی، وغیرہ گونہ گوں اصلاحات کا آغاز اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے افراد میں ایک ایسا گروہ نہ موجود ہو جس میں طول تفکر، حسن تمیز، اصابتِ رائے اور جرأتِ اخلاقی ہو۔

یہ گروہ عموماً نوجوانوں میں سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اُن میں بڑھاپے کی عافیت اندیشور کے بدلے جوانی کی ولولہ خیزیاں ہوتی ہیں جو اُن کو حریت، پستی، بلندی اور حق گوئی کی طرف بڑھاتی ہیں، اس لیے ایک مصلح کا فرضِ اولین نوجوانانِ قوم کی اخلاقی اور دماغی پرداخت ہے۔

تعریف

جس طرح کہ سنگ چقماق میں آگ پوشیدہ ہے اسی طرح انسان میں گوناگوں صدہا قویٰ پوشیدہ ہیں، ان قویٰ سے جب ابتدا کام لیا جاتا ہے تو کسی قدر تعمد وتکلف کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب عرصہ تک برابر سلسلۂ استعمال جاری رہتا ہے تو پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے استعمال کے لیے قصد وارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ حسب موقع وہ از خود کارفرما ہونے لگتے ہیں اور اگر بہت زیادہ عرصہ تک اُن کا استعمال جاری رہتا ہے تو وہ اس طرح جزو زندگی بن جاتے ہیں کہ اُن سے

علحدگی کے لیے نہ صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ تکلیف ہوتی ہے جب انسان کسی موت کے استعمال کا اس درجہ تک خوگر ہو جاتا ہے تو یہ خوگری عادت یا خلق کہلاتی ہے۔

اخلاق کی شکل پذیری

تم نے بارہا دیکھا ہوگا ایک آہنی تار بالکل سیدھا تھا، مگر جب کسی شکل پر لپیٹا گیا تو اُس کی بھی وہی شکل ہوگئی، اور اگر زیادہ عرصہ تک لپٹا رہا تو وہ شکل تار میں اُس درجہ راسخ ہوگئی کہ اس کا سیدھا کرنا دشوار ہوگیا، قوئی اخلاق کی بھی بعینہ یہی حالت ہے وہ ابتداً بے شکل ہوتے ہیں لیکن جب عرصہ تک ایک مخصوص اسلوب پر استعمال کیے جاتے ہیں تو وہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اقسام اخلاق

گو ہماری زبان میں اخلاق کا استعمال اکثر اخلاق حُسنہ بلکہ اخلاق حسینہ کی ایک خاص صنف یعنی خاطر مدارات کی معنی میں ہوتا ہے چناں چہ خوش اخلاق اُس شخص کو کہتے ہیں جو ملاقات میں اعتناد والتفات کو کام فرماتا ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ اخلاق کا دائرہ معانی اس قدر تنگ نہیں۔ اخلاق مجموعہ عادات کا نام ہے اگر عادات اچھے ہیں تو وہ شخص خوش اخلاق ہے اور اگر بُرے ہیں تو بداخلاق ہے۔

میں اس وقت اخلاق کی پیش پا افتادہ تقسیم حمیدہ وذمیمہ سے گذر کے دو اور تقسیمیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) اخلاق طبعی: یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان اپنے ساتھ لے کے پیدا ہوتا ہے ان کا استیصال ناممکن مگر تقویت وتضعیف ممکن ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا بعض لوگوں میں ان کی صحبت کے عام

اخلاق کے خلاف بعض عادتیں پائی جاتی ہیں یہ وہی عادات ہیں جن کو ہم فطری کہتے ہیں۔

(۲) اخلاق کسبی: یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان صحبت سے سیکھتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ اُس میں قریباً اتنے ہی جاگزین ہو جاتے ہیں جتنے کہ اخلاق طبعی راسخ ہوتے ہیں۔

یہ تقسیم ہنٹ کی تھی، پروفیسر ڈیوی امریکی نے اخلاق کی حسب ذیل تقسیم کی ہے۔

وہ اخلاق جن کا تعلق

۱۔ ادراک سے ہے

۲۔ جذبات سے ہے

۳۔ ارادہ سے ہے۔

اخلاق متعلق بہ ادراک وہ اخلاق ہیں جن کے ذریعہ سے کذب وصدق وہم وشک ظن ویقین وغیرہ میں تمیز ہوتی ہے۔

اخلاق متعلق بہ جذبات وہ اخلاق ہیں، جن کا تعلق جذبات سے ہے جیسے حُسن دوستی، لذت پسندی وغیرہ۔

اخلاق متعلق بہ ارادہ وہ اخلاق ہیں، جن کا تعلق ارادہ سے ہے جیسے صبر، استقلال، حلم، وغیرہ۔

سرچشمہائے اخلاق

انسان میں اخلاق کے تین سرچشمے ہیں۔

۱۔ وراثت

۲۔ موثرات

۳۔ ارادہ

وراثت۔ عموماً بچہ جس شخص سے جس قدر قریب ہوتا ہے، اُسی قدر اُس سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے، مثلاً بچہ سب سے زیادہ والدین سے قریب ہوتا ہے، اس لیے وہ نسبتاً سب سے زیادہ والدین سے مشابہ ہوتا ہے، والدین کے بعد والدین کے والدین سے قریب ہوتا ہے، اس لیے تیسری چوتھی پشت کے لوگوں کی بہ نسبت اُن سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے، وہلم جراً، مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں بسا اوقات اس کے خلاف شہادتیں ملتی ہیں۔

موثرات خارجیہ:۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) فضاء مادی، جیسے آب و ہوا چناں چہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ معتدل ممالک کے لوگ عموماً راحت طلب، عیش پسند، اور کاہل ہوتے ہیں لیکن غیر معتدل ممالک کے لوگ چاق و چوبند، چست و چالاک، محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ غیر معتدل ممالک میں گرم ممالک کے باشندے سریع الانفعال ہوتے ہیں وہ جس قدر جلد خوش ہوتے ہیں اُسی قدر جلد ناراض ہوتے ہیں، سرد ممالک کے باشندے بطی الانفعال ہوتے ہیں مگر جب متاثر ہوجاتے ہیں تو وہ تاثر پھر جلد زائل نہیں ہوتا، وغیرہ۔

(۲) فضاء اخلاقی، احباب، اصدقاء، معلمین و بیک لفظ صحبت یا سوسائٹی، اسپنسر کہتا ہے کہ ''انسان اپنے والدین سے زیادہ اپنے ہم نشینوں سے مشابہ ہوتا ہے، صحبت کے اثر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک پیشے کے لوگوں میں بہت سے اخلاق مشترک ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ اگر دو نہایت ہی قریب کے رشتہ دار، دو مختلف پیشے کے ہوتے ہیں تو اُن دونوں کے اخلاق باہم دیگر اُس سے کم مشابہ ہوتے ہیں جتنے کہ دونوں کے اخلاق اپنے اپنے ہم پیشہ لوگوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔'' ایک فرانسیسی مثل ہے کہ تم اپنے ہم نشینوں کو مجھے بتادو، میں تمھیں یہ بتادوں گا کہ تم کیسے ہو'

ارادہ اخلاق کے دو سبب یعنی اسلاف اور صحبت (سوسائٹی) کا انتخاب انسانی قدرت سے باہر ہے لیکن تیسرا سبب یعنی ارادہ اس کی قدرت میں ہے بیشک یہ صحیح ہے کہ وراثت اور صحبت کا اثر نہایت سخت راسخ ہوتا ہے مگر باوجود اس کے انسان کا ارادہ اگر قوی ہو تو اس اثر کو زائل کرسکتا ہے۔

اگر ہم عبرت آموز نظر سے اشخاص کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو ہم کو بہت سے لوگ ملیں گے جن میں اُن کے بزرگاران خاندان اور اُن کی صحبت کے خلاف اخلاق موجود ہوں گے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ان اخلاق کا سرچشمہ نہ وراثت ہوگی اور نہ صحبت، اب جو چیز رہ جاتی ہے، وہ طبیعت کا میلان اور ارادے کی مساعدت ہے پس یہی دو چیزیں اُن کا سرَ چشمہ ہوں گی۔ اسی بنا پر علمائے اخلاق کا یہ خیال ہے کہ انسان کا مستقبل وراثت اور صحبت سے زیادہ اُس کے ارادے پر موقوف ہے، اس نظریہ کی مزید تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ دنیا میں جتنے ارباب اخلاق پیدا ہوئے ہیں وہ ایسی قوموں میں سے پیدا ہوئے ہیں جن کی اخلاقی حالت نہایت بدتر تھی اور قطعاً ان میں سے اتنے بڑے ارباب اخلاق کے پیدا ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

ارادے کے مدارج مختلف ہیں، بعض اشخاص کا ارادہ فطرتاً نہایت قوی ہوتا ہے اور بعض کا کمزور، اور بعض کا متوسط درجہ کا۔ جس طرح جسم ورزش اور نگہداشت سے بڑھتا ہے، بعینہٖ یہی حالت ارادے کی بھی ہے، اگر کوشش کی جائے تو ایک کمزور ارادہ قوی اور ایک قوی ارادہ قوی تر ہوسکتا ہے بچپن میں تمام قویٰ انسانی کا آغاز ظہور ہوتا ہے اس وقت وہ ہر طرح کی تربیت قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس لیے ارادے کی تربیت اور تقویت کا بہترین زمانہ طفولیت کا زمانہ ہے۔ اسی لیے مغرب میں بچوں کو تیسرے یا چوتھے ہی برس سے استواری عزم و پختگی ارادہ کی تعلیم دیجاتی ہے۔

اخلاق کی آراستگی

اخلاق کی ماہیت اور اسباب کے معلوم ہونے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی آراستگی یا تہذیب کا کامیاب ترین ذریعہ کیا ہے؟

قدرت نے انسان میں مختلف قویٰ ودیعت کیے ہیں، جن کی نشو ونما کے لیے غذا اور ورزش کی ضرورت ہے، مگر جس طرح کہ اُن قویٰ کے جو ہر مختلف ہیں اسی طرح اُن کی غذا اور ورزش مختلف ہے، جسمانی قویٰ کی غذا اور ورزش ماکولات ومشروبات اور العاب ریاضیہ (جمناسٹک) ہیں مگر اخلاقی قویٰ کے لیے یہ چیزیں بے کار ہیں ان کی غذا افکار عالیہ اور ان کی ورزش زمانہ کی کشمکش ہے۔ جس طرح کہ ہر شخص کے جسم کے لیے ایک ہی قسم کی غذا اور ایک ہی نوعیت اور ایک ہی حد تک کی ورزش مفید نہیں، اسی طرح ہر شخص کے لیے ایک ہی نوعیت کے افکار عالیہ اور ایک ہی نوعیت وشدت کی کشمکش زمانہ مفید نہیں، اس لیے آراستگی اخلاق کے شائق کے لیے دو امر نہایت ضروری ہیں۔

۱۔ اخلاقی غذا کے لیے ایسے افکار کا انتخاب، جو اُس کی طبیعت کے مناسب ہوں۔

۲۔ زندگی کی اُن کشمکشوں سے اجتناب جو اُس کی طبیعت کے غیر مناسب ہوں۔

شرائط کامیابی

جس طرح انسان کی جسمانی ترقی کے لیے اسلاف کی صحت، آب وہوا کی عمدگی قویٰ کے استعمال وتعطیل میں اعتدال، حزن ومسرت میں توازن وغیرہ شرائط ہیں اسی طرح اخلاقی ترقی کے لیے بھی چند شرائط ہیں۔ اولین شرط والدین کے جسم وعقل کی تندرستی ہے، مگر افسوس کے جس قدر یہ شرط مقدم ہے اُسی قدر اس کی طرف سے غفلت کی جاتی ہے، مائیں جو بچوں کے پالنے میں رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھتیں اور باپ جو اولاد کی تعلیم وتربیت میں کسی چیز سے بھی دریغ نہیں

کرتے، عموماً اس نہایت اہم شرط سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ وہ اپنی صحت لذائذ زندگی یا غفلت کی بدولت تباہ کر دیتے اور اُس کا خمیازہ صرف وہ خود کھینچتے ہیں بلکہ اُن کے بعد آنے والی نسلیں پُشت ہا پُشت تک کھینچتی رہتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہزار ہا بچوں کی جسمانی دماغی، اور اخلاقی کمزوری کے ذمہ دار اُن کے والدین کی کمزوری ہے۔

دوسری شرط حُسن تربیت ہے بیشک یہ صحیح ہے کہ جوانی یا بڑھاپے میں اصلاح اخلاق محال نہیں لیکن قریب محال ضرور ہے کیوں کہ انسان جس وقت پیدا ہوتا ہے اُس وقت وہ ایک لوحِ سادہ ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کے نقش قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے لیکن جب ایک نقش کھینچ جاتا ہے تو اُس کا مٹنا اکثر دشوار طلب اور کبھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو قوم چاہتی ہے کہ اُس کی آئندہ نسلوں کی اخلاقی حالت عمدہ ہو، اُس کو چاہیے کہ اس سادہ لوح پر شروع ہی سے عمدہ نقش کھینچے، اس کے لیے اس کو حسب ذیل امور ملحوظ رکھنا چاہئیں۔

۱۔ ایسی فضاء کا انتخاب جو اخلاق رذیلہ کی سمیت سے محفوظ ہو۔

۲۔ اخلاقی قویٰ کا صحیح اندازہ تاکہ جو حصہ کمزور ہو اُس کو خاص طور پر قوی کیا جائے۔

۳۔ مرکز نظر کے لیے کوئی بلند شے پیش کرنا۔

۴۔ افکار عالیہ کی تلقین۔

۵۔ روزانہ زندگی میں اصول اخلاق کا نفاذ۔

حسب ذیل قویٰ کو خاص طور پر اُبھارنا چاہیے۔

۱۔ حقیقت پرستی

۲۔ جرات اخلاقی

۳۔ استواری عزم

ابتدائی تربیت اور مشرق

مشرق میں بچوں کی اخلاقی تربیت کا بہترین آلہ "قمچی" یا "تسمہ" سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہایت سخت غلطی ہے مارنے سے بجز اس کے بچے کے دل میں معلم کی ہیبت اور اس عادت سے نفرت پیدا ہو اور کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ بچے کی اخلاقی تربیت کا صحیح ترین اصول یہ ہے کہ جس عادت سے باز رکھنا منظور ہو، پہلے اُس کے فوائد اور نقصانات اُس کو سمجھائے جائیں، اور اُس کے بعد اس کے چال چلن کی نگرانی رکھی جائے، فراموشی کے وقت اُس کو یاد دہانی کی جائے یاد دہانی کے ساتھ بچے کو اُس کے فوائد مضار کی طرف متوجہ کیا جائے اس طرح بچہ بہت جلد خود بخود تعمیل حکم کرنے لگے گا۔

بچے کی پہلی اخلاقی درسگاہ گھر ہے اور اس کے بعد مدرسہ کا نمبر ہے مگر گھر میں صرف زمین تیار ہوتی ہے تخم پاشی درحقیقت مدرسہ میں آ کے ہوتی ہے۔ اس لیے جس طرح زمین کے تیار کرنے میں سخت توجہ کی ضرورت ہے اسی طرح تخم پاشی اور اُس کی آبیاری کے لیے بھی اعتناء شدید کی حاجت ہے نصاب میں اخلاقی کتابوں کا داخل کرنا یا دارالخطابہ (لکچر روم) میں اخلاقی تقریروں کا ہونا، اُس وقت تک مفید نہیں ہوسکتا جب تک کہ خود مدرس کی شخصیت با اخلاق نہ ہو۔ کتاب کے نقوش اور تقریروں کے ہوائی تموجات معلم ہیں مگر مردہ۔ لیکن مدرس زندہ معلم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان پر جو ایک زندہ معلم کا اثر ہوسکتا ہے وہ ایک مردہ معلم کا نہیں ہوسکتا۔ پس اگر مدرس کی کتابِ زندگی میں اخلاقی سبق نہیں تو محض نصاب کی کتابوں یا دارالخطابہ میں بلاغت کار تقریروں سے اخلاقی تربیت کی امید غلط امید ہے۔

دیگر امور کی طرح یہ نکتہ بھی مغرب کے پیش نظر اور مشرق کے پس پشت ہے مغرب میں بچوں کے لیے مصنف، معلم، اور مربی زبردست شخصیت وعلمیت کے لوگ ہوتے ہیں مگر مشرق میں

اس کے بالکل برعکس ہے، موخرالذکر میں بچوں کی تعلیم و تربیت کم درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اس کو صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دیگر ذرائع سے معاش پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرق کے فرزند اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مغرب کے فرزندوں سے اخلاق میں پیچھے رہتے ہیں۔

ماہنامہ العصر مرتبہ پیارے لال شاکر (میرٹھی) اگست ۱۹۱۶ء

☆☆☆

مذہب وسائنس

مذہب کی بنیاد

مذہب کا خیال بہت قدیم اور عالمگیر ہے، مسٹر ایڈورڈ، بی، ٹیلر بھی جواز منہ قدیم کے مذہب واعتقادات کے مستند محقق ہیں اس کی تائید کرتے ہیں چناں چہ اس خیال کی تحقیقات کرتے ہوئے کہ دنیا میں ایسی ادنیٰ قومیں بھی موجود ہوں گی جو مذہب سے نا آشنا ہوں، محقق موصوف تحریر فرماتے ہیں

''.......یہ امر اُن اقوام کی حالت سے بہت کچھ مشابہ ہے جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی کوئی زبان ہی نہیں، یا جن کو آگ کے استعمال سے ناواقف سمجھا جاتا ہے، اگر چہ ایسا ہونا ممکنات سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی اقوام دنیا میں موجود نہیں ہیں، اسی طرح یہ خیال بھی کہ زمانہ قدیم میں چند ادنیٰ درجہ کی لا مذہب اقوام موجود تھیں اگر چہ قیاساً ممکن ہے اور شاید واقع میں صحیح ہو لیکن اس بارے میں کافی ثبوت نہیں ملتے، یعنی وہ ثبوت جو اس قسم کی عجیب روایات پر یقین کرنے کے لیے ہم طلب کرنے کے مستحق ہیں۔''

دنیا کے تمام مذاہب میں جو اعتقادی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اُس کے متعلق ٹیلر صاحب فرماتے ہیں۔

''ایسا مذہب ایک بھی نہیں ہے جو اپنے اعتقادات کے لحاظ سے

دیگر مذہب سے بالکل مختلف ہو، چنانچہ مسیحیت کے موجودہ اصول و خیالات اُن ذہنی و عقلی نشانات سے وابستہ ہیں، جن کا سلسلہ مسیحیت سے بہت پہلے انسانی تہذیب وشائستگی کی بنیاد تک بلکہ شاید انسانی ہستی کے آغاز تک چلا جاتا ہے۔''

مسٹر ہربرٹ اسپنسر تحریر فرماتے ہیں۔

''مذہب کے بارے میں ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ باوجود اپنی بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے اُس نے ایک برتر سچائی کا اظہار اور اُس کی اشاعت کی ہے۔ اس اعلیٰ سچائی کو پہچاننا، گو نامکمل اور ناقص طور پر ہی سہی ابتدائے عالم ہی سے مذہب کا ایک ضروری مقصد رہا ہے اور مذہب نے اپنے مختلف نقائص کی وجہ سے جو کسی وقت بے شمار تھے لیکن رفتہ رفتہ کم ہوتے رہے ہیں، اس برتر سچائی کا مکمل وصحیح اندازہ کرنے میں بے حد زکیں اُٹھائی ہیں حتیٰ کہ مذہب مشکل سے اُس کے ایک حصہ کو پہچان سکا ہے نیکی ہمیشہ مذہب کا حقیقی مذہبی عنصر رہی ہے اور غیر مذہبی عنصر وہ ہے جو بلحاظ عقائد ''ناپائدار،، اور بلحاظ افعال واعمال ''پُر عیب ثابت ہوا ہے اور مذہب نے ہمیشہ اس عنصر سے پاک رہنے کی کوشش کی ہے۔''

دنیا کے نظام کو حل کرنے میں مذہب نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے؟ وہ بیج کہاں ہے جو اس عالمگیر اور ترقی پذیر درخت کے پھلنے، پھولنے اور بڑھنے کا باعث ہوا ہے؟ اُس ''برتر سچائی'' کا مسکن کہاں ہے جس کی طرف اسپنسر نے اشارہ کیا ہے؟ اور مذاہب کے اعتقادات کی وہ ''ہم آہنگی''

کہاں نظر آسکتی ہے جس کو ٹیلر نے بیان کیا ہے؟

ان سوالات کا جواب دینے سے قبل اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا مذہب سے کوئی خاص مذہب مراد ہے؟ نہیں! بلکہ مذہب سے وہی مذہب مراد ہے جس کا اطلاق اُس لفظ ''مذہب'' پر ہے جو ساری دنیا میں مشترک ہے، یعنی وہ فطرت جو بنی نوع انسان کو مشترکہ طور پر قدرت کی طرف سے بخشی گئی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مذہب کی نسبت ساری دنیا کا خیال یکساں ہو، اسلاف نے اس مبحث پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے کسی نے مذہب سے نفرت ظاہر کی، اور کسی نے اس کو صداقت وراستی پر مبنی قرار دیا کسی نے مذہب کے خیال کو اچھا کہا، اور کسی نے بُرا، ہماری یہ آرزو بھی نہیں بر آسکتی کہ ہم دنیا کے تمام مذاہب کے درمیان کوئی خاص تعلق یا ہم آہنگی پاسکیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فرقہ یا گروہ جو مذہب کا پابند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے حقیقت میں اُس کے اصول بے دینی پر مبنی ہوں!

خاص مذاہب یا خاص فرقوں کو جانے دیجیے ہمیں مذہب کے ''معانی'' اُن عام اصولوں میں تلاش کرنا چاہیے جن کے آگے دنیا والوں کی ایک بڑی تعداد نے مختلف زبانوں میں سرتسلیم خم کیا ہے۔ یا اُن ''معانی'' کو خیال مذہب کے مستقل مظاہر اور اُن اعتقادات میں ڈھونڈھنا چاہیے جو کرۂ زمین کے نہایت قدیم باشندگان میں کسی تعلیم وہدایت کے بغیر یعنی خود بخود پیدا ہوئے اور اب تک زمانہ، موجودہ کے مہذب وشائستہ گروہوں میں زیادہ پختہ اور مکمل صورت میں پائے جاتے ہیں اور سب کے آخر میں ہمیں ان کو موجودہ بڑے بڑے مذاہب کے متفقہ ومشترکہ عقائد میں دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ موجودہ مذاہب میں قدرتی طور پر صرف وہی مذہبی عقائد موجود ہوں گے جو دیگر اعتقادات کے مقابلہ میں موجود رہنے کے زیادہ قابل ثابت ہوئے ہیں۔

(۱) معاد اور سزا وجزائے روح

حکیم سقراط کا قول ہے کہ ''مجھے کامل یقین ہے کہ مرنے کے بعد انسان پر ضرور کوئی نہ کوئی حالت گذرتی ہے، اور یہ حالت بمقابلہ بدوں کی حالت کے نیک لوگوں کے لیے بدرجہا بہتر ہوگی''۔

مرنے کے بعد سزا وجزا کا خیال بہت قدیم خیال ہے انسان اپنے افعال کی سزا وجزا یا موت کے بعد کسی خوفناک شئے سے بے حد موثر ہوا ہے وہ اس سے بچنے کی ہمیشہ ایسی ہی کوشش کرتا رہا ہے جیسی کہ خونخوار جنگلی حیوانات طوفان یا آگ سے محفوظ رہنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس ''کامل یقین'' کی وجہ موجبہ کیا ہے؟ علم ہمیشہ محسوسات ومشاہدات سے پیدا ہوتا اور جاری رہتا ہے۔ دنیا کے قدیم باشندوں نے بھی مشاہدات ہی کے ذریعہ سے علم حاصل کیا، مشاہدات ہی کے ذریعہ سے اُنھوں نے یہ دریافت کیا کہ پانی سے پیاس بُجھتی ہے، فلاں فلاں حالتوں میں شکار ملتا ہے، غار پناہ دیتا ہے دو چیزوں کے رگڑنے سے آگ، پیدا ہوتی ہے، آفتاب روشنی اور گرمی کا سرچشمہ ہے بعض پودے زہر آلود ہیں، جاڑے کی شدت پژمردہ کر دیتی ہے، بجلی ہلاک کرتی ہے!

شیر خوار بچہ بھی جب اپنا پہلا سبق سیکھتا ہے تو وہ محسوسات کا ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ انسان خوراک، حفاظت، اور مہربانی کا منبع ہے تھوڑے دن بعد اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے سے وہ چل پھر سکتا ہے پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشیاء ضرررساں اور بعض فائدہ مند ہیں، بعض تلخ اور بعض شیریں، یہ گرم اور وہ سرد، بعض ہلکی اور بعض وزنی، پھر یہ دریافت ہوتا ہے کہ بعض کاموں کا نتیجہ اچھا ہے، اور دوبارہ اُن کے کرنے میں کوئی ہرج نہیں، فلاں کام نقصان دہ ہے اس لیے اُس سے پرہیز لازم ہے فائدہ بخش کاموں کو وہ اچھا سمجھتا ہے اور نقصان رساں کاموں کو بُرا، زبان سے پہلا لفظ نکالنے سے پہلے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ فلاں اسباب سے فلاں نتائج پیدا ہوتے ہیں یعنی نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہیں!

یقیناً سب سے پہلا مذہبی خیال سزا و جزا کا خیال تھا جو انسان کے دل میں پیدا ہوا، اور کچھ شک نہیں کہ اس خیال کی بنیاد سلسلہ، علل و نتائج پر رکھی گئی تھی، اور اب تک اسی پر قائم رہی، یہ ایک ایسا مناسب اصول ہے جو ہر کہ و مہ پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ دنیا کے قدیم باشندوں نے سب سے پہلے یہی معلوم کیا کہ فلاں کام کا نتیجہ اچھا ہے، اور فلاں کام کا بُرا، اس علم اور یقین کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اُنھوں نے علت و معلول میں ایک خاص تعلق دریافت کر لیا۔

علت و معلول یعنی سزا و جزا کا خیال یا احساس انسان کی سرشت میں داخل ہے جب اُس نے اپنے اُن تعلقات کو معلوم کر لیا جو بیرونی دنیا اور سلسلہ قدرت سے ہیں اور ان تعلقات کی بنا پر اُس نے ایک ''برتر ہستی'' کا اعتراف کیا، تو یہ فطری احساس خود بخود پیدا ہو گیا، قدرت کے انسانی تعلقات دو ضروری احکام کے پابند ہیں اور اُس نے زبان حال سے قدیم انسان کو یہی پکار کر کہا کہ ''یہ کر'' اور ''وہ نہ کر''! بالاتر قوتوں کی موجودگی میں، جن میں سے بعض خوفناک اور بعض مہربان ہیں، انسان کو اُس کی تابعداری کے مادہ نے اس بات کو یقین کرنے پر مجبور کیا کہ اُس پر ایک صاحب اختیار طاقت حکمران ہے، جو زبردست ہے، وہ گناہوں کی سزا اور نیکیوں کا اجر دیتی ہے نیک و بد افعال کا ثمرہ بخشتی ہے۔ جیسے جیسے اس کے فہم و ادراک میں ترقی ہوتی گئی اُس کے ذمہ داری کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا گیا، حتیٰ کہ اُس کا خیال اس دنیوی زندگی سے گذر کر حیات بعد الممات کی طرف رجوع ہونے لگا یہ امر اُس کے دلنشین ہو گیا کہ وہ آئندہ زندگی بہ نسبت بُرے آدمیوں کے اچھوں کے لیے بہتر ہو گی۔

برنٹن کا خیال ہے کہ ''انسان کے افعال محض فوری فائدہ کے خیال سے نہیں ہوتے، بلکہ جو فرائض اُس کے ذمے عائد کیے گئے ہیں اُن کی غایت بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور کوئی ''برتر ہستی'' اُن کی مقرر کرنے والی ہے'' اس نظریہ کو قدیم ادنیٰ اقوام نے بہت کم سمجھا، لیکن زمانہ مابعد کے مذاہب

نے رفتہ رفتہ اس کو مکمل طور پر تسلیم کیا، دنیا میں اب کوئی بھی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیروؤں کو کسی نہ کسی بالاتر قوت یا قوتوں کا کامل اطاعت و ذمہ داری کی تاکید و تلقین نہ کرتا ہو۔

جملہ مذاہب کا سنگ بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ انسان کے اعمال و افعال میزان عدل میں تولے جائیں گے اس عقیدہ کا اثر نہ صرف موجودہ زندگی میں محسوس ہوتا ہے بلکہ یہ آئندہ زندگی میں بھی جاری رہتا ہے یہی عقیدہ پرستش و رضا جوئی کا باعث ہے اور یہی تمام مذہبی مسائل سزا و جزا، آخرت، نجات، ابدی عذاب، اور بہشت و دوزخ کی بنیاد ہے۔

(۲) بقائے روح کا اعتقاد

مسٹر اڈورڈ ٹیلر فرماتے ہیں کہ ''مذہب کی ادنیٰ تعریف روحانی ہستیوں کا اعتقاد ہے جو اُن تمام ادنیٰ اقوام میں بھی پایا جاتا ہے جن سے ہم نے گہرے تعلقات پیدا کیے ہیں'' اگر روحانی ہستیوں کے اس اعتقاد کو کمال تک پہنچایا جائے اور اُس کے معانی کو زیادہ وسعت دی جائے تو ٹیلر صاحب کے قول کے مطابق اُس کی تشریح ''روحانیات کو ماننا اور حیات بعد الممات کا اعتقاد'' رکھنا ہو گی۔

بقول مسٹر ٹیلر فلسفہ مذہب کا سنگِ بنیاد یہی اعتقاد ہے، جس پر وحشی سے لے کر ترقی یافتہ انسان تک سب یقین رکھتے ہیں اور یہی اعتقاد ایک قدیم و عالمگیر فلاسفی قرار دیا گیا ہے۔

گرانٹ ایلن کے خیال کے مطابق ایک یا متعدد معبودوں پر یقین رکھنے بلکہ نذر و نیاز کے ذریعہ سے خبیث ارواح اور دیوتاؤں کی پرستش و رضا جوئی حاصل کرنے کی رسم سے بھی زیادہ اور ضروری ایک اور عنصر ہے جو مذہب اپنے دیگر عناصر کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہے وہ عنصر ''حیات بعد الممات'' کا خیال ہے، آئندہ زندگی کے یقین ہی پر مذہب کی بنیاد قائم ہے''۔

برنٹن لکھتا ہے۔ میں تمھیں کئی ایسے ادنیٰ اور بودے مذاہب کا پتہ دے سکتا ہوں جن کا کوئی معبود یا قربان گاہ نہیں، جو مذہبی رسوم اور عبادت سے محض معرا ہیں لیکن کسی ایسے مذہب کا پتہ دینا میرے لیے امکان سے باہر ہے، جو روحانی قوتوں اور انسان کے باہمی میل جول، اور بات چیت پر اعتقاد رکھنے کی تعلیم نہ دیتا ہو۔''

ڈی الوبلا لکھتا ہے۔ گذشتہ بیس سال کی دریافتوں نے جو بالخصوص فرانس و بلجیم کے غاروں میں کی گئی ہیں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ نہایت ہی قدیم زمانہ کے انسان بھی جنازہ کی رسم ادا کرتے تھے، آئندہ زندگی کے قائل تھے، اور دیویوں اور بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے۔''

ہکسلے لکھتا ہے:۔ بہت سی ایسی وحشی اقوام موجود ہیں، جو مطلق خدا کی ہستی سے بے خبر ہیں، لیکن کوئی قوم ایسی نہیں جو خبیث ارواح کی قائل نہ ہو''۔

ہربرٹ اسپنسر کے قول کے مطابق ''فنائے جسم کے بعد بقائے روح کا خیال مع اپنے اُن لاانتہا اور پیچیدہ قیاسات کے جو اُس سے پیدا ہوتے ہیں....دنیا کے تمام حصوں میں ....اور ہر جگہ برابر پایا جاتا ہے یہ خیال اُن اقوام میں بھی جو صورت و شکل میں ایک دوسرے سے متغائر ہیں اس قدر صفائی کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ ماہرین فن کو مجبوراً یہ رائے قائم کرنا پڑی ہے کہ یہ قومیں بحر و بر کی موجودہ تقسیم سے بہت پہلے ہر چہار اطراف عالم میں پھیل گئی تھیں حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ ہر نوع کے انسان میں موجود ہے اور ہم اس اعتقاد کو غیر مہذب، نیم مہذب اور مہذب غرض جملہ اقوام میں یکساں پاتے ہیں۔''

کوئی مذہب بقائے روح کے اعتقاد سے معرا نہیں۔ البتہ قدیم عبرانیوں کا ضرور یہ عقیدہ تھا کہ فنائے جسم کے بعد روح ایک ایسی مہمل زمینی حالت میں چلی جاتی ہے، جس کو کسی صورت میں 'زندگی'' کے نام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ مگر زمانہ حال کے عبرانیوں نے قدیم یہودیوں کی

مادیت یعنی انکار روح کی تردید کردی ہے۔ چھ سو برس سے زائد مدت تک یہودیوں کا ایک فرقہ حشر موتیٰ کا معتقد رہا ہے۔

اہالیان چین نے بھی کنفیوشس کی تعلیم کو غلط قرار دے کر ایک حد تک اُس کو رد کر دیا ہے، کیوں کہ کنفیوشس کا عقیدہ روحانیت سے معرّا و مبرّا تھا، اور چینی مذاہب سراسر روحانیت سے پر ہیں۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ چینیوں کا ایسا واجب التعظیم فلاسفر کنفیوشس اور نہ عہد عتیق کے اور مصنف ہی اپنے پیروؤں کو ''آئندہ زندگی'' پر یقین رکھنے سے مستقل طور پر باز رکھ سکے۔

عالمگیر اور پائدار مذہب اُسی کو کہا جاسکتا ہے جو انسان کی حیات بعد الممات پر کوئی حد قائم نہ کرے بعض ایسے معلم بھی گذرے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف مستورات یا متاہل لوگ، یا بزرگ و برتر اشخاص ہی اس طبعی موت کے بعد زندہ رہیں گے اور بعض معلموں نے تو یہ فتویٰ بھی دے دیا ہے کہ حیات بعد الممات کوئی چیز ہی نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان تعلیمات نے کوئی خاص یا مستقل اثر انسان کے دل پر نہیں کیا، نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام موجودہ مذاہب فنائے جسم کے بعد بقائے روح کے قائل ہیں، یعنی وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ انسان کا سلسلہ حیات فنائے جسم کے ساتھ منقطع نہیں ہو جاتا بلکہ یہ سلسلہ آئندہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔

(۳) ایک صاحب اختیار اور اعلیٰ طاقت کا اعتقاد

جہاں تک ہمارا علم رہبری کرتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ہستی سے بالاتر طاقتوں اور قوتوں کا اعتقاد ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر مذہب و مشرب کا آدمی ان طاقتوں کا قائل ہے حتیٰ کہ دہریے اور ناستک بھی ان طاقتوں کے مقر ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی ایسی اعلیٰ اور زبردست طاقت موجود ہے جس کو ہم نہیں جان سکتے۔

مشہور ہے کہ بدھ مذہب خدا کا قائل نہیں، اور اس بنیاد پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب کے لیے خدا کا یقین لازمی نہیں ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی اعلیٰ و برتر ہستی (خدا) کا قائل نہ ہو۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ وہ کسی اعلیٰ منصف طاقت کو تسلیم نہیں کرتا، بدھ مذہب سے زیادہ کسی اور مذہب میں سزا و جزا کے ابدی اثرات تسلیم نہیں کیے گئے جیسا کہ ''کرم'' کی تعلیم سے ظاہر ہے، قدیم انسانوں کا خیال کسی صاحب اختیار ہستی کی نسبت بہت ہی دُھندلا اور نامکمل تھا۔ وہ اس ہستی کو نہ صرف پہاڑوں، چٹانوں، سورج، چاند، ستاروں اور اپنے بزرگوں میں پرتو فگن پاتے تھے بلکہ حیوانات مچھلیوں، اور رینگنے والے جانوروں میں بھی اس کا ظہور پاتے تھے۔ بہرکیف خواہ وہ کسی صورت میں اس برتر ہستی کو تسلیم کرتے ہوں، مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ قوت ان کے لیے ایک منصف اور صاحب اختیار ہستی تھی، جس کے آگے ان کا سرِ طاعت خم ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ یعنی انسانی تہذیب و ترقی کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان طاقت کے متعلق علم بھی وسیع ہوتا گیا۔ پُرانے اور ادنیٰ خیالات کی جگہ نئے اور اعلیٰ خیالات پیدا ہونے لگے۔ تو ہم پرستی کی جگہ بُت پرستی نے لے لی، پھر بہت سے معبودوں کی پرستش شروع ہوئی، جو آخر کار ''ایک'' معبود کی عبادت میں تبدیل ہوگئی۔

قدیم انسان کے تنگ و محدود عقائد کے مقابلہ میں ترقی یافتہ فرقوں نے اُس سب سے بڑے حاکم اور منتظمِ حقیقی کی طرف نہایت اعلیٰ اور شاندار صفات منسوب کی ہیں۔ قدیم آریہ اپنے بڑے دیوتا ''ورن'' میں، ہندو اپنے پرمیشور ''برہما'' میں عبرانی اور مسیحی اپنے قادرِ مطلق ''یہوواہ'' میں، اہلِ ڈنمارک اپنے مطلق باپ ''اودن'' میں، یونانی اپنے سب سے بڑے دیوتا ''زیوس'' میں، رومی اپنے خدائے عظیم ''مشتری'' میں اور مسلمان اپنے وحدہٗ لاشریک ''اللہ'' میں شانِ الوہیت و معبودیت تسلیم کرتے ہیں۔ اُس برتر و اعلیٰ ہستی کی قدرت و فضل کے اظہار کے لیے نہایت موزوں و مناسب

الفاظ اختیار کیے گئے، مثلاً پروردگار، عالم، الٰہی، حی القیوم، قادرِ مطلق، حاضر و ناظر، زمین و آسمان کا مالک، حاکموں کا حاکم وغیرہ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو بالعموم خدا کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ بہرحال خدا سے مراد وہی خدا ہے، جو نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے، جو ہمیں ہمارے اعمال و افعال کا بدلہ دینے والا، اور ایک صاحب اختیار اور منصف حقیقی ہے۔

ماہنامہ العصر مرتبہ پیارے لال شاکر (میرٹھی) اگست ۱۹۱۶ء

☆☆☆

سقوطِ ادرنہ

ایڈریانوپل جو خلفاء بلقان کی راہ کامیابی میں بظاہر آخر مانع کامیابی تھا، بالآخر مسخر ہوگیا، مع (جامع سلیم) کی مقدس محرابوں کے، جنہوں نے دو صدیوں سے اپنے نیچے صرف سجدہ ہائے نیاز اور زمزمہ ہائے توحید و تکبیر ہی کو دیکھا تھا اور مع اُن بلند اور عظیم الہیت میناروں کے، جن پر آج تک روزانہ اعلان و شہادت توحید کی ایک صدا ابھی قضا نہ ہوئی تھی وہ فتح ہوگیا، حالاں کہ ہمارے جوش و بیداری کا لشکر عظیم اب تک غفلت و سرشاری کے قلعہ میں محصور ہے اور عبرت اور تنبیہ کہ پیہم ہجوم اب تک اُسے مسخر نہیں کر سکے!! فیا حسرتا! ویا ویلتا!! ویا ندما!!!

لمثل هذا يذوب القلب من كمد　　　ان كان فى القلب اسلام و ايمان

میں سفر میں تھا جب میں نے اول بار یہ خبر سنی میں نے دیکھا کہ اس خبر کی تصدیق کے بعد بھی دنیا ویسی ہی تھی جیسی اس سے پہلے، میں نے دیکھا کہ ہم اپنے کاروبار میں مصروف اور اپنی احتیاجات میں بدستور منہمک ہیں، وقت پر کھانا کھاتے ہیں اور وقت پر آرام دہ نیند کے انتظار میں بستروں کو تلاش کرتے ہیں۔ زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور اپنے اندر بھی دیکھا تو حالت ویسی ہی پائی جیسی کہ کل تک تھی، حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی اس خبر کے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

میں نے سوچا کہ کیا کسی دن اسی طرح قسطنطنیہ کے مسخر ہوجانے کی خبر آجائے گی؟ قسطنطنیہ کیا شئے ہے؟ میں نے سوچا کہ کیا ایک دن ہماری آخری متاع عزت یعنی بیت جلیل خلیل اللہ اور مسجد مطہرہ رسول اللہ پر بھی ملاعنہ، صلیب کے حملہ آور ہوجانے کی خبر آجائے گی، اور ہم اسی طرح اپنی رفتار مدہوشی میں آگے بڑھ جائیں گے، فما ذاجرئ على المسلمين؟ ومن الذى دفع

بهم من عليين الى اسفل سافلين؟

ولقد اخذ ناهم بالعذاب فما استكانو الربهم وما يتفرعون ۔ (۲۳۔ع۔۴) اور ہم نے ان لوگوں کو عذاب میں گرفتار کردیا، پھر ان کو کیا ہوگیا ہے کہ اب بھی اپنے خدا کے آگے نہیں جھکتے اور اپنی غفلت پر نہیں روتے!

دنیا میں قوموں کے لیے بڑے بڑے کام ہیں بہت سے ہیں جن کو اپنے ایوان حکومت اور تختِ جلال کی آرائش کرنی ہے، بہت سے ہیں جن کو اپنے عظیم الشان متمدن شہروں اور اپنی عالمگیر تجارت کی حفاظت مقصود ہے بعض اپنی قومی دولت و ثروت کے بڑھانے کی فکر میں ہیں اور بعض خدا کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے انتظام میں، لیکن غور کرو کہ اب ہمارے لیے دنیا میں کیا کام باقی رہ گیا ہے؟ حکومتیں باقی نہیں رہیں، کہ ان کے دبدبہ و سطوت کا نقارہ بجائیں، دولت و ثروت کب کی جا چکی ہے اور جو رہ گئی ہے وہ بھی آتش زدہ ہے نئی زمینوں پر قبضہ کرنے کی فکر کیا کریں کہ جو چند گوشے اپنے ایام ذلت و نکبت بسر کرنے کے لیے باقی رہ گئے تھے، اُن کے لائق بھی نہ نکلے، تہذیب و تمدن کی جگہ وحشت و جہالت کو ہمارا مایہ انسانیت سمجھا جاتا ہے، اور دنیا کی قوموں کی فہرست میں ہمارے نام کے ساتھ، ''وحشی'' اور ''ناقابل حیات زندگی'' کے القاب لکھے جاتے ہیں کیوں کہ اللہ کی زمین پر رہنے کے اب قابل نہیں رہے ہم سے زمینیں چھین لینی چاہئیں، اور جس قدر جلد ممکن ہو، ہمارے بار ذلت سے دنیا کو پاک کردینا چاہیے، ہماری تیرہ سو برس کی تاریخ کے بعد، آج کل کی سرگذشت حیات صرف اتنی ہی باقی رہ گئی ہے! فيا للعار! ويا للاسف !! واہ! اہ! ثم اہ !!

گلگونۂ عارض ہے نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا!

ہماری تمام متاع اقبال لُٹ چکی ہے، ایوانِ حکومت کُھد رہے ہیں، اور تخت شاہی اُلٹ

گئے ہیں، اب ہمارے پاس کچھ باقی رہ گیا ہے، تو بس یہی چند مسجدوں کی محرابیں ہیں، اور چند عبادت گاہوں کے صحن، اور یا پھر وہ گنبد سبز، جس کے نیچے دنیا کا سب سے بڑا انسان سو رہا ہے۔

لیکن آج ایڈریانوپل کی جامع سلیم کے صحن میں بلغاریوں کے بوٹوں کی گرد اُڑ رہی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ کل اور کیا کچھ نہ ہوگا۔

پھر اے وہ لوگو! کہ اپنے ایوانِ حکومت کی حفاظت نہ کر سکے کیا آج خدا کی عبادت گاہوں کی محرابوں اور اُس کی صدائے توحید بلند کرنے کے مناروں کی بھی حفاظت نہ کر سکو گے؟؟

غفلت سرشت انسان کا قاعدہ ہے کہ بہت سی مصیبتیں اس کے لیے اس قدر جگر دوز اور زہرہ گداز ہوتی ہیں کہ ان کا تصور بھی کرتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے لیکن پھر جب وقت آ جاتا ہے اور وہ مصیبت سر پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے، تو کچھ دیر تک متحیر رہ کر، کچھ دیر رو دھو کر اور کچھ دیر ماتم وفغاں سنجی کر کے آگے بڑھ جاتا ہے، اور جس وقت کے تصور سے لرز جاتا تھا، اس کو اس طرح جھیل جاتا ہے، گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہ تھا!

ایک مدت سے ہم عالم اسلامی کے آخری مصائب کے تصور سے کانپ رہے ہیں ’’آخری وقت‘‘ اور ’’فیصلہ کن وقت‘‘ ہماری زبانوں پر ہے ہم اُس وقت کا ذکر کرتے تھے۔ جب اعدائے اسلام ہمارے نیست ونابود کر دینے کے لیے اکٹھا ہو جائیں گے، ہم اس مصیبت کبریٰ کے خیال سے لرز اُٹھتے تھے، جب دشمن قسطنطنیہ کے دروازوں پر آ پہنچیں گے ہم غافلوں کو ڈراتے تھے، کہ ہوشیار ہوں، کیوں کہ ایک وقت آنے والا ہے، جب آخری فیصلہ کی گھڑی سر پر آ جائے گی، ہم سوتوں کو جگاتے تھے، کہ اُٹھ کھڑے ہوں، کیوں کہ وہ ’فزع اکبر‘‘ اور طامۃ الکبریٰ‘‘ کا وقت کبھی نہ کبھی آنے والا ہے، جب کہ فنا وبقاء اور موت وحیات کا فیصلہ آخری ہو جائے گا۔

پھر اگر آنکھیں کھول کر دیکھو تو اس وقت موعودہ اور مصیبت منتظرہ کا دن تو آ گیا، اور اگر

اس کی آخری ساعات نہیں آئی ہیں، تو اس کو بھی دور نہ سمجھو، لیکن کیا اپنی غفلت پیشگی کی عام عادت کی طرح اس بارے میں بھی ہمارا ویسا ہی حال ہوگا، جیسا کہ ہر آنے والی مصیبت کے آ جانے کے بعد ہوا کرتا ہے؟ کیا ہم اسے بھی جھیل جائیں گے؟ کیا چند آنسوؤں کی ریزش، اور چند آہوں کی کشش سے اور کچھ نہ ہوگا؟ اور کیا پانی سر سے گذر جائے گا۔ اور ہمارے ہاتھوں کو حرکت نہ ہوگی۔

خاک بدہنم، تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو، کہ وہ سب کچھ ہو گیا، جس کے ہونے میں اب کچھ دیر نہیں ہے چشم تصور سے کام لو کہ جس آخری ساعت کے تصور سے ڈرتے تھے وہ مع اپنی آخری ہلاکتوں اور بربادیوں کے آ گئی۔ انگلستان نے عرب وعراق اور حجاز وحرمین کی ریاست کی دیرینہ آرزو پوری کر لی، شام پر فرانس نے قبضہ کر لیا، بقیہ ایشیاء جرمنی کے زیر علم آ گیا، قسطنطنیہ اور دردِانیال کا بھی وہ حشر ہو گیا، جو مسئلہ مشرقی کے انفعال کے وقت سب سے پہلے ہو کر رہے گا، اور اپنی موت کی آخری خبر بھی ہم نے موجودہ جنگ کی خبروں کی طرح ریوٹر کی زبانی سُن لی، تو پھر بتلاؤ کہ اُس وقت اس کے سوا اور کیا ہوگا، جو کچھ کہ اس وقت ہو رہا ہے؟ کیا در و دیوار سے سر ٹکراؤ گے؟ کیا آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور صحراؤں میں چلے جاؤ گے؟ کیا گنگا اور جمنا کی سطح تم کو اپنی آغوش میں لے کر بچائے گی؟ یا بحر عرب کی موجوں میں تمہیں پناہ مل جائے گی؟

اگر ایسا نہ ہوگا، تو پھر کیا دنیا میں کوئی انقلاب عظیم ہو جائے گا؟ کیا آفتاب اپنے مرکز حرکت کو چھوڑ دے گا؟ کیا زمین حرکت سے معطل ہو جائے گی؟ کیا ستارے آپس میں ٹکرا جائیں گے؟

اگر یہ بھی نہ ہوگا تو کیا ہم رات کا سونا اور دن کا کاروبار چھوڑ دینگے؟ کیا کھانا پینا بالکل بند کر دیں گے؟ اور کیا ہم کو زندگی کی احتیاج باقی نہیں رہے گی؟

حالانکہ ہم کو دنیا کے اندر تبدیلی پیدا ہونے کی خواہش کا کیا حق ہے جب ہم خود اپنے اندر

کوئی تبدیلی پیدانہیں کرسکتے؟

دنیا اس طرح کبھی نہیں بدلی ہے، اور وہ ہماری امیدوں اور ولولوں کے تابع نہیں ایران نے بابل کو مسمار کردیا، مگر آفتاب اسی وقت طلوع ہوا، جیسا کہ روز ہوتا تھا، سکندر نے ایران میں آگ لگادی، مگر انسان نے اپنے گھروں کو، اور صحرا کی چڑیوں نے اپنے آشیانوں کو نہیں چھوڑا، بابل ونینوا کے عظیم الشان تمدن برباد ہوگئے، مگران کی بربادی کے ماتم میں شاید کائنات کے ایک ذرے نے بھی زحمت نہ اٹھائی، یونان اور رومتہ الکبرٰے کے طلائی مندروں اور سنگی دارالعلوموں کی دیواریں سرنگوں تھیں اور اسکندریہ کے بیت العلم کا چراغ گل ہوگیا تھا، مگر عرب کے شتر سواروں نے کب اس کی پرواہ کی، اور اس انقلاب عظیم نے کب کاروبار عالم کو معطل کیا؟

اس کائنات ارضی کی گھڑی اپنے کیل پُرزوں پر چل رہی ہے اور وہ ان حوادث وتغیرات سے بند نہیں ہوسکتی، بس اس کی تبدیلی کی خواہش بے فائدہ ہے، اس میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہماری خاطر اب ہوگی، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، البتہ ایک دنیا خود تمہارے اندر موجود ہے، سخت تعجب اور حیرت ہے اگر ان حوادث وانقلاب سے خود اس کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہو! اور اگر اس وقت نہ ہوگی، تو پھر اور کس وقت کا انتظار ہے۔

ہماری ساری بدبختی اس میں ہے کہ ہم اپنی فتح وشکست کو ایڈریانوپل کے سامنے ڈھونڈھتے ہیں، حالاں کہ اس کا اصلی میدان تو ہمارے دل کے اندر ہے، وفی انفسکم افلا تبصرون؟ جب تک ہم خود اپنے اندر فتح یاب نہ ہوں گے، اُس وقت تک باہر بھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ہاں ایک وقت آنے والا تھا، اور وہ آگیا، ایک یوم الفصل تھا، جس کا آفتاب طلوع ہوگیا، پرانی پیشن گوئیوں میں کہا گیا تھا، کہ آفتاب مغرب سے نکلے گا، اور توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب مغرب سے نکل چکا ہے اور توبہ کا دروازہ (فقط مایہ امیدواری ماید بختاں

عالم بود) روز بروز ہم پر بند ہورہا ہے، پس وقت آگیا ہے کہ جس کو اٹھنا ہے، اُٹھے، جس کو چلنا ہے چلے، اور جس کو اپنے رُوٹھے ہوئے خدا سے صلح کرلینی ہے کرلے، کیوں کہ ساعت آخری، نتائج سامنے، مہلت قلیل، اور فرصت مفقود ہے۔

جنگ عظیم

موت اور ہلاکت کے وہ اوقات الیمہ جو خون کی رگوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سے انسان کی جانوں کو کھینچ لیتے ہیں، اور آبادیاں اجاڑ اور زندگیاں ہلاک ہوجاتی ہیں، وہ ارواحِ حروب وقتال جو زندگی کے لیے موت کا اور آبادی کے لیے ویرانی کا دروازہ ایسی عجلت اور ایسی آسانی سے کھول دیتی ہیں، گویا کسی لپٹے ہوئے بند کو کھول دیا گیا، وہ ہلاکت اور موت کی عظیم الشان ہستیاں جن پر انسان پاش توپیں لدی ہوئیں اور آگ اور خون کے خونخوار درندے سوار ہیں۔ اور جو سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں، تاکہ اپنے اپنے شون وامور کی تدبیر کریں، ان سب کی چھائی ہوئی ہیبت اور پھیلی ہوئی وحشت کی ستم اور ان سب کی پھیلائی ہوئی موت اور برسائی ہوئی ہلاکت کی گواہی، کہ ارضِ الٰہی کا امن ڈوب گیا، انسانیت کی بستی اجاڑ ہوگئی، نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا، اور دنیا مثل اس بیوہ کے ہوگئی جس کا شوہر زبردستی قتل کردیا گیا ہو اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے لٹے ہوئے سنگھار پر ماتم کرے گی، اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دے گی، کیوں کہ اس کا حُسن زخمی ہوگیا، کیوں کہ اس کا شباب پامال کردیا گیا، اور اس لیے کہ اس کے فرزندوں نے اس پر تلوار اٹھائی، اور اس لیے کہ اس کے دوستوں نے اسے کچل دیا، پس زندگی کی جگہ موت، عیش وسلامتی کی جگہ اضطراب، نغمہ نشاط کی جگہ شور ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی، آبِ زندگی کی جگہ بحر خونیں بستیوں کی جگہ قبریں، اور زندگی کے کاروبار اور بازاروں کی چہل پہل کی جگہ موت کے وہ جنگل جن میں لاشیں سڑیں گی اور ہولناک سمندروں کے وہ خونیں طوفان جن میں

انسان کی لاشیں مچھلیوں کی طرح اچھلیں گی، اور اے دنیا کے بڑے بڑے مغرور شہروں کے بسنے والو! کل تک تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا، تا زندگی پر گھمنڈ اور طاقت پر مغرور ہو پر آج تم موت کے کھلونے ہو جنہیں بگاڑ دیا جائے گا، اور ہلاکت کی مورتیں ہو جنہیں مٹا دیا جائے گا اور پھر اے وہ کہ تمدن کی بہشت، علم کے مرغزار، اور عیش ونشاطِ زندگی کے حیرت آباد اور عجوبہ زار تھے! تم کل تک دوسروں کی موت وہلاکت کی خبریں سنتے تھے پر آج تمہاری ہلاکت کی خبریں پڑھی جائیں گی۔ تم کل تک تمہارے پاس کرۂ ارضی کی مصیبتوں کا قلم تھا پر آج تمہاری مصیبتوں کی تاریخیں مدون ہوں گی تم کل تک دوسروں پر ظلم وقہر کرتے تھے پر آج تم پر ظلم کیا جائے گا، تم کل تک دوسروں کے لیے آگ سلگاتے تھے، پر آج تمہارے لیے جہنم بھڑک رہی ہے تم کل تک ضعیفوں اور ناتوانوں کے لیے درندے تھے پر آج درندوں میں خود چل گئی، اور بھیڑیوں نے آپس میں ایک دوسرے پر پنجہ مارا، تم کل تک دنیا کے لیے موت کی بجلی اور ہلاکت کی بدلی تھے پر آج کوئی نہیں جو تمہیں ہلاکت کی بارش اور بربادی کے رعد وبرق سے بچا سکے، کل مشرق کی بربادیوں کا تم نے تماشا دیکھا تھا، آج وہ تمہاری ہلاکت کو دیکھ رہا ہے۔

پس آج کا دن وہ دن ہے کہ مسلمان اربابِ کفر پر ہنستے ہیں اور امن وراحت سے بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں، ہاں! اب تو وہ وقت آ گیا کہ انہوں نے اپنے اعمال کا بدلہ پایا۔ (القرآن)

ماتم انسانیت

انسان کی سوئی ہوئی طبیعت وبہیمیت پھر جاگ اٹھی ہے وہ اشرف المخلوقات کہ صورت سے آدمی مگر خواہشوں میں بھیڑیا، محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ، اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات، مگر اپنی روح بہیمی اور اپنی مردم خواری کے سب سے زیادہ بُرے

وقت میں آ گیا ہے، وہ کل تک اپنے کتابوں کے گھروں اور علم وتہذیب کے دار العلوموں میں انسان تھا، پر آج چیتے کی کھال اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیے کے پنجے اس کے دندانِ تبسم سے زیادہ نیک ہیں، درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن وراحت ملے گی، مگر اب انسانوں کی بستیاں اور اولادِ آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہو گئی ہیں کیوں کہ وہ جو خدا کی زمین پر سب سے اچھا اور سب سے بڑھ کر تھا، اگر سب سے برا اور سب سے کمتر ہو جائے تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی اور نیک نہ تھا، ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی بُرا بھی نہیں ہو سکتا۔

شیر خونخوار ہے، مگر غیروں کے لیے، سانپ زہریلا ہے، مگر دوسروں کے لیے، چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کمتر جانوروں کے لیے لیکن انسان، دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق، خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لیے درندہ و خونخوار ہے۔

انسان ہی ہے جو فرشتوں سے بہتر ہے۔ اگر اپنی قوتوں کو امن وسلامتی کا وسیلہ بنائے۔ اور انسان ہی ہے، جو سانپ کے زہر اور بھیڑیے کے پنجے سے بھی زیادہ خونخوار ہے اگر راہِ امن وسلامتی کو چھوڑ کر بہیمیت اور خونخواری پر اُتر آئے۔

یہی انسانیت اعلیٰ اور ملکوتیت عظمیٰ ہے جس کی تقویم وتکمیل کے لیے دینِ الٰہی اور شریعت فطری کا ظہور ہوا، اور یہی پیغامِ امن، رہنمائے صلح وصلاح، اور وسیلہ، فوز وفلاح ہے، جس کا دوسرا نام ''اسلام'' ہے، یعنی جنگ کی جگہ صلح، خون وہلاکت کی جگہ عمران وحیات اور بربادی وخرابی کی جگہ سلامتی وامنیت ہے، وہ بتلاتا ہے کہ اگر انسان اپنی قوتِ ملکوتی اور فطرتِ صالحہ سے کام نہ لے، تو وہ بڑے ہی گھاٹے ٹوٹے میں ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر خسران ونقصان کیا ہو گا جس میں آج دنیا مبتلا ہے؟ وہ دنیا جس نے

قوتوں کی صیقل کی، جس نے فطرت کے قوانین مستورہ کو بے نقاب کیا، جس نے عقل ادراک کے خزانے کھلوا دیئے، جس نے ارتقائے فکر وعلوئے مدرکہ سے دنیا کو علم کا گھر اور دریافتوں اور تحقیقوں کی مملکت بنا دیا، جو علم و مدنیت کے انتہائے عروج سے متوالی ہوگئی، جو قوتوں کے حصول کے نشے سے بدمست ہو کر مغرورانہ جھومنے لگی، جس نے کہا کہ انسان کے سوا کچھ نہیں، اور جس نے اعلان کیا کہ مادہ کے اوپر کوئی نہیں، کیا آج اس کا یہ علم، یہ مدنیت عظمٰی، یہ ایجادوں کا ڈھیر، یہ مخترعات کا انبار، یہ بیشمار، کتابوں کی جلدیں اور یہ لاتعداد تحصٰی دماغوں کے افکار عالیہ و مدنیہ، ایک لمحہ، ایک دقیقہ کے لیے بھی اس ہولناک بربادی، اس خوفناک تصادم اس وحشت انگیز خونخواری، اس خون کا سمندر بہانے والی، اور لاشوں کے جنگلوں کو بھر دینے والی جنگ کو روک سکتے ہیں۔ اور نوعِ انسانی کو عالمگیر نقصان دہ ہلاکت سے بچا سکتے ہیں؟ کیا قانون کشش ثقل جس پر نئے علم کو ناز ہے، اس سے بچالے گا؟ کیا قوت برقی کا کشف اسے روک دے گا؟ کیا بھاپ اور اسٹیم کی ایجاد کچھ سفارش کر سکے گی، اور انسان کو غمگینی سے بچالے گی؟ آہ! یہ ایجادات محیرہ، یہ مخترعات مدہشہ، یہ محدثات منورہ، جس پر مدنیت کو ناز اور علم انسانی کو غرہ ہے امن وسلامتی کی جگہ خود ہی ہلاکت اور بربادی کا وسیلہ، اور خون اور آگ کی افزائش وتضاعف کا ذریعہ ہیں، اگر پہلے دنیا کے لیے صرف کمان کا تیر اور تلوار کی دھار تھی، تو آج تمدن کی بدولت ایک ایک سکنڈ میں کئی کئی مرتبہ چھوٹنے والے ہلاکت بار گولے اور لمحوں اور منٹوں کے اندر شہروں اور قلعوں کو مسمار کر دینے والے آہن پوش جہاز ہیں، پھر اے علم و مدینہ کا شیطان کیا تو اس لیے آیا تھا کہ خدا کی آبادی کی ویرانی کو دوگنا اور اس کی ہلاکت کے آلات کو زیادہ مہلک اور لاعلاج بنا دے؟ اور اے انسان کی غفلت اور اے اولاد آدم کی نادانی! تو کب تک خدا سے لڑے گی، اور کب تک اس کی زمین کے امن وراحت کو روکے گی؟ حالاں کہ تمدن اور علم تجھے قوی بنا سکتا ہے پر نیک نہیں بنا سکتا۔

رستخیز تصادم

اور دیکھو یہ کیسی آگ ہے جو بھڑک اٹھی ہے اور کس طرح تمدن کی حسین وجمیل آبادیاں آگ اور دھوئیں کی ہولنا کی کے اندر ویران ہو رہی ہیں۔ یہ دنیا کی مغرور وفتح مند طاقتوں کی ٹکر ہے، اور اتنی بڑی انسانی درندوں کی لڑائی جتنے بڑے خونخوار اسباع وبہائم آج تک کرۂ ارضی پر پیدا نہیں ہوئے، دنیا نے ٹیٹس کے قصے سنے ہیں جس نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ دنیا نے بخت نصر کو دیکھا ہے، جو بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ دنیا نے ایرانیوں کے قہر واستیلا کے افسانے سنے گئے ہیں، جنہوں نے مسمار کر دیا تھا اور رومیوں کے عہد تسلط وعروج کے ایسے بہت سے فاتح خونریزوں کی روایتیں محفوظ رکھی گئی ہیں، جنہوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقوں کو بہت ستایا، اور اُس کی زمین پر بہت فساد کیا۔ اور اسی طرح ہم نے ہر آبادی میں اس کے بڑے بڑے سرکش گنہگار پیدا کیے تاکہ وہ فتنہ وفساد پھیلائیں۔ (القرآن)

لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے، اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی اشد شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی، زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں، مگر نہ تو ایسی زندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے، اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا، جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لیے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں، پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرور طاقت سے جھوم رہی ہے، اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں، اُس بھیڑیے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے چیختا ہوا اٹھا ہے، اور اُس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک روسو کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لیے پلا ہے! یہ کیسے مہیب اور یہ کیسے خوفناک

آلات سے مسلح ہیں؟ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارضی کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا؟ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی بھی نہ ہوئی، اور خداوند کا ایسا غصہ جواب تک کبھی بھی زمین پر نہ ہوا:-

الأمة الكبرىٰ

اور دیکھو کہ قدرت الٰہی کی یہ کیسی ہولناک نشانی ہے جو ایام الالٰہیہ کی گذشتہ نشانیوں کو یاد دلاتی ہوئی، غفلت کی دنیا اور غرور انسانی کی بستی پر بجلی کی طرح چمک رہی ہے، اور رب الافواج کہتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ کے جلال صولت اور جبروت انتقام کو نمایاں کروں گا، یہ اُس کے آواز کی ایسی گرج اور اُس کے دستِ جلال کا ایسا معذب وار ہے، جو ہزاروں برسوں کے عصیان وتمرد کے بعد ظاہر ہوتا ہے، اور اس بجلی کے مانند جو سرسبز کھیتوں پر گری اور اُس طوفان کی طرح جو یکایک زمین پر چڑھتا، اپنا کام پورا کردیتا ہے، یہ اس کا قانون ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور کبھی اس میں تغیر نہیں ہوسکتا، اس قانون انتقام وتبدل نے آبادیاں بدلیں، بستیاں اجاڑیں، عمارتیں منہدم کیں، قوموں کو ہلاک، مملکتوں کو ویران، اور بسے بسائے شہروں کو نابود اور نئی آبادیوں سے اپنی زمین کو معمور کردیا۔

اور وہی قانون ہے، جس کے اندر سے خدا کا دستِ قہار پھر چمکا ہے اور وہ اپنی زمین کے موجودہ مالکوں سے ان کے کاموں کا حساب لینا چاہتا ہے، جیسا کہ پچھلوں سے لیا گیا۔

متمدن قوموں کا غرور انتہائی حد تک پہنچ چکا ہے طاقتوں اور عجیب عجیب ترقیوں نے انہیں متوالا کردیا ہے، ان کو حسب سنن الٰہیہ زمین کی حفاظت کا منصب دیا گیا، لیکن انہوں نے قوت پاکر جنگ وفساد کی راہ اختیار کی، اور طغیان وعصیاں سے ارض الٰہی کو بھردیا۔

پس ضرور تھا کہ غرور وطغیان کے لیے کوئی حد ہوتی عجب نہیں کہ مہلت ختم ہوگئی ہو اور کچھ اچنبھا نہیں، اگر ارضِ الٰہی کے امن کے لیے بندگانِ خدا کی راحت کے لیے اور کمزوروں کو سکھ کی نیند

سلانے کے لیے اُن کا خون اُنہی کے ہاتھوں بہایا جائے جنہوں نے دوسروں کا خون اپنے ہاتھوں بہایا، اور اسی طرح عدالت الٰہی ان قوتوں کا حساب لے جو صدیوں سے تمام دنیا کے اعمال کا حساب لے رہے ہیں۔

یہ دنیا کا غرور طاقت ہے، جواب رنگ لایا ہے، یہ قوت اور سیادت ارضی کی وہ غذا ہے جو اس نے بڑی ہی حرص وطمع سے کھائی پر ہضم نہ ہوسکی، اور اب اسی کا فساد اس کی تندرستی کے لیے مہلک ثابت ہوا ہے۔

یورپ کا تمدن، اس کی طاقت، اُس کا جنگی اقتدار اس کے عجیب عجیب اسلحہ اور برباد کن ہولناکیاں اس کے مہیب جہاز، اور کئی کروڑ تک پہنچ جانے والی متحدہ فوج، ایسی قاہر د جابر تھی کہ ان کی تنبیہ کے لیے خود انہی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا، انہوں نے اپنے سوا ہر قوت کو پامال کیا، اور اپنے سوا اور کچھ رہنے نہ دیا، پس کون تھا جو اُن کے مقابلے میں نکلتا اور دنیا میں کس کا ہاتھ اتنا قوی تھا جو ان کے آہنی پنجوں پر پڑتا؟ وہ کہ سب سے بڑے ہوگئے تھے، اُن کے لیے وہ لوگ کیا کام دے سکتے تھے جو آج سب سے چھوٹے ہوگئے ہیں؟ ان کے جہازوں کے مقابلہ کے لیے ان کے جہازوں سے بڑھ کر جہاز چاہیے تھے، مگر وہ کہاں بنتے؟ ان کی توپوں کے لیے ان کی توپوں سے زیادہ ہلاکت بار توپیں درکار تھیں، مگر وہ کہاں ڈھلتیں؟ پس جب زمین پر ان سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا۔ جس کے اندر سے خدا کا ہاتھ ظاہر ہوتا، تو دیکھو حکمت الٰہی نے کس طرح خود اُنہی کو ان پر مسلط کردیا، اور اس کی یہ تدبیر کی کہ باہمی جنگ وقتال میں مبتلا ہوگئے، اب ان کا ہولناک تمدن جس کو ایک ہزار سال کے اندر انہوں نے تیار کیا تھا، اُنہی کی تخریب میں کام آیا، اور ان کی ہر ترقی اور ہر بڑائی خود انہی کے لیے وسیلہ تعذیب ہوگئی۔ اگر ان کی توپوں سے بڑھ کر دوسروں کے پاس توپیں نہ تھیں، تو انہی کی توپوں کے گولے اُن کے لیے اڑنے لگے اور ان سے بڑھ کر جنگی جہاز دوسروں کے پاس نہ تھے تو وہی جہاز ان

کے مقابلے کے لیے سمندر میں تیرنے لگے، ہر پتھر جو انہوں نے اٹھایا، خود اُنہی کے لیے اُڑا، اور ہر آلہ جو انہوں نے تیار کیا وہ انہیں کے لیے متحرک ہوا، اُنہوں نے بڑا سامان کیا تھا مگر خدا کا سامان سب سے بڑا ہے۔

یہ کون ہیں؟

یہ کون ہیں؟ جو آپس میں خون اور ہلاکت کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، یہ وہ ہیں جنہیں امن کے شہزادہ نے ان کے اولیں ظہور کے وقت وعظ سنایا تھا جب کہ وہ گلیل اور یہودیہ اور یردن پہاڑ کی بھیڑ کو دیکھ کر کوہِ زیتون پر چڑھ گیا، اور اُس نے اپنے شاگردوں کے لیے تعلیم دی۔

مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیوں کہ وہ آسودہ ہوں گے، مبارک ہیں وہ جو دل کے حلیم ہیں، کیوں کہ وہ زمین کو ورثہ میں پائیں گے، مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں، کیوں کہ ان پر رحم کیا جائے گا، مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیوں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔

پس یہ غریب ہیں، حلیم ہیں، رحمدل ہیں، زمین پر فتح اور امن کرانے کے لیے خداوند کے بیٹے ہیں، کیوں کہ انہیں کہا گیا تھا۔

تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا کہ خون نہ کرنا، پر میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصہ ہوگا وہ سزا کے لائق ہوگا۔ تم سُن چکے ہو، کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا، کہ اپنے پڑوسی کو پیار کرو۔ اور اپنے دشمن سے عداوت رکھو، پر میں تم سے کہتا ہوں، کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا مانگو تا کہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھہرو۔

پس یہ ہے کہ اس مقدس تعلیم کا آخری ظہور جو دنیا کے سامنے ہے، اور یہ ہے وہ پاک امانت جو شہزادہ امن نے اپنی نسل کو دی، تا کہ وہ آسمانی باپ کے بیٹے کہلائیں ان کو غربت کا، حلم کا، تحمل

کا، صلح وانسیت کا پیغام دیا گیا تھا کہ یہودیوں کو خون کرنے سے روکا گیا، مگر ایک مسیحی اپنے بھائی پر غصہ بھی نہیں کریگا، وہ شریر کے مقابلہ سے بچے گا، اور دشمن تک کو پیار کرے گا، مگر آج ''مسیح'' دنیا میں نہیں ہے جو دیکھے، کہ خداوند کے بیٹے کہلانے والے کس طرح خداوند کی زمین کی سب سے بڑی خونریزی کے لیے اٹھے ہیں اور خون بہانے کے ایسے ایسے ہتھیار ان کے کاندھوں پر ہیں جو زمین نے آج تک نہ دیکھے تھے۔

آہ، آج اُن کا وہ حال ہوگیا ہے جس کی زبور میں خبر دی گئی، جس کے لیے یشعیاہ نبی نے نبوت کی، جس پر یرمیاہ نبی نے نوحہ پڑھا، جس پر خرقی ایل نے ماتم کیا، اور جس کے لیے ملاکی نبی نے آخری آنسو بہائے یہ سب کچھ یہودیوں کے لیے اس سے زیادہ نہ تھا جتنا آج خود اُن کے لیے ہوسکتا۔ جو یہودیوں کو اس حالت سے چھوڑانے آئے تھے۔

''کوئی راست باز نہیں، ایک بھی نہیں کوئی خدا کا طالب نہیں، ایک بھی نہیں، سب گمراہ ہیں، سب بیکار ہوگئے کوئی بھلائی کرنے والا نہیں ایک بھی نہیں ان کا گلا کھلی ہوئی قبر ہے ان کے ہونٹوں میں سانپوں کا زہر ہے ان کا منہ لعنت اور کڑواہٹ سے بھرا ہوا ہے ان کے قدم خون بہانے کے لیے تیز ہیں ان کی راہوں میں تباہی اور بدحالی ہے، وہ سلامتی اور امن کی راہوں سے واقف نہ ہوئے ان کی آنکھوں میں خدا کا خوف نہیں''

(زبور ۱۴۔ یشعیاہ ۵۹۔ ۷)(الہلال)

روح انتخاب (مجموعہ ادب) لاہور

☆☆☆

AFKAAR-E-AZAD

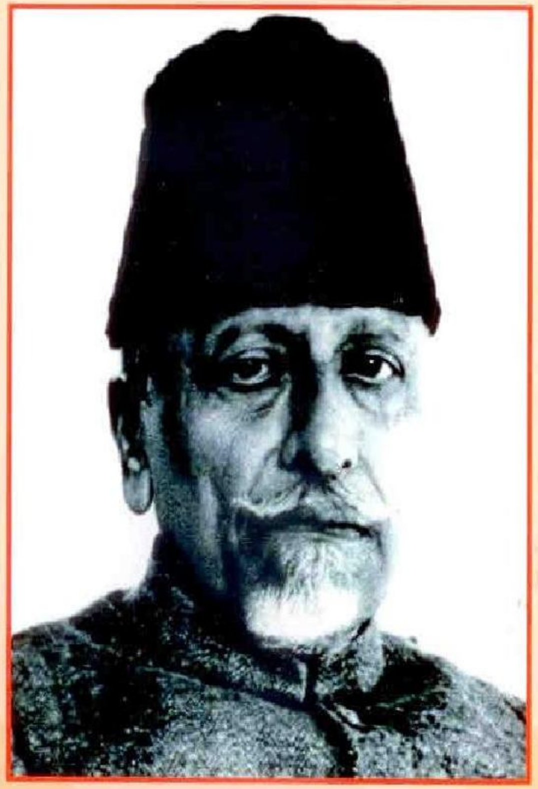

Compiled by

DR. MOHD. SHUJATH ALI RASHED

Dy. Director & I/C

Centre for Urdu Language, Literature & Culture

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad.

علی جواد زیدی

مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں

ہے وہی معرکۂ نیکی وشر میرے بعد
کم ہیں ایسے جو کریں عرضِ ہنر میرے بعد

چند ساعت کے لیے رک بھی گیا رو بھی لیا
تھم نہ جائیں کہیں یارانِ سفر میرے بعد

جذب تھیں جس میں مرے خونِ وفا کی چھینٹیں
آج غمناک سے ہیں اہلِ نظر میرے بعد

ہجر کی رات لرزتا ہی رہا پلکوں پر
کارواں پھر بھی ہے سرگرم سفر میرے بعد

شاید اے دوست! تجھے بھی کبھی آجائے نظر
بن گیا سجدہ گہ خلق وہ در میرے بعد

آج انجان بنو، بھول بھی جاؤ لیکن
قطرۂ اشک بنا نجمِ سحر میرے بعد

کیوں بچھاتے ہو مری راہ میں کانٹے یارو!
آئنے میں مری محتاط نظر میرے بعد

اب بھی شورِ قدم راہرواں ہے تو وہی
کیا کروگے مری یاد آئے اگر میرے بعد

کیا کوئی اور بناتا تھا نشیمن اپنا
خیر جاری سے بدل جائے گا شر میرے بعد

اک مری یاد کی مشعل کے سوا کچھ بھی نہ ہو
پھر بھی سونی ہے تری راہ گزر میرے بعد

یہ تموج یہ تلاطم، یہ شہادت ، یہ شہود
پھر اسی شاخ پہ ہے رقصِ شرر میرے بعد

رات اس طرح سے بھی ہوگی بسر میرے بعد
ختم ہے منزل اول کا سفر، میرے بعد

اشک آنکھوں میں بھرے اس نے بھی دیکھا زیدی
آج محفل کو بہ انداز دگر میرے بعد

ہما ۱۹۶۷